C-659

[illegible]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ امّا بعد

(کابل میں ہمارے سات سال)

۴ر شوال ۱۳۳۳ھ موافق اگست ۱۹۱۵ء کو میں کابل کی طرف روانہ ہوا۔ اس سے تخمیناً ۴ مہینے پہلے ہندوستان چھوڑنے کا ارادہ مصمم کر چکا تھا۔ اپریل ۱۹۱۵ء کے شروع میں دہلی سے سندھ چلا آیا اور یہ چار مہینے مختلف مقامات پر گذارے دوستوں سے آخری ملاقات اور ضمناً راستہ کے خطرات سے محفوظ رہنے کی تدابیر میں مصروف رہا۔ بفضلہٖ تعالیٰ بلوچستان سے گزر کر ۱۵ر اگست کی نماز مغرب سرحد افغانستان پر پڑھی اور توکلاً علی اللہ بغیر کسی پاسپورٹ حاصل کرنے کے افغانستان میں داخل ہوا۔ جس حصہ ملک میں ہم داخل ہوئے وہ شوراچک کا علاقہ تھا۔ وہاں کے حاکم سے ملا۔ پاسپورٹ نہ ہونے کی وجہ سے انھیں شکوک پیدا ہونے لگے۔ مگر ہماری درخواست سن کر کہ آپ ہمیں سرکاری حفاظت سے قندھار پہنچا دیں۔ وہاں ہم حکومت کو مطمئن کر دیں گے۔ چند سوالات پوچھے اس کا جواب ان کے رفع شبہات کے لیے کافی تھا۔ اس لیے ہمیں حکومت کا معزز مہمان قرار دیا۔ اور ہمارے قندھار پہنچانے کا مناسب انتظام کیا۔ قندھار میں ہمارے بعض آشنا مل گئے۔ ان کا حکومت میں اچھا رسوخ تھا اور ہمیں اچھی طرح جانتے تھے۔ اس لیے نائب الحکومت نے چند روز نہایت احترام سے مہمان رکھا۔ فقط کابل کے سفر کا نہیں بلکہ چند روز کابل میں رہنے کا بھی انتظام کر دیا۔ اس طرح ہم ۱۵ر اکتوبر

سنہ ۱۹۰۵ بہلہ چھپے۔ اتفاقات زمانہ میں یہ بھی ایک عجیب بات سمجھی جائے گی کہ اسی تاریخ ۱۵ اکتوبر سنہ ۱۹۲۲ کو ہمیں کابل سے سفر کرنے کا پاسپورٹ مل گیا اگرچہ ہماری روانگی ۲۲ اکتوبر کو عمل میں آئی۔

ان سات سال اور سات دنوں میں جو کچھ ہم نے دیکھا اس کا اکثر حصہ اس قابل نہیں کہ عام طور پر کتابوں میں لکھا جائے لیکن کچھ قدر واقعات لکھنے کو ہمارا جی چاہتا ہی رہا۔ ان واقعات سے پہلے ہم چند فصول افغانستان اور اس کی سلطنت کے متعلق لکھتے ہیں جس سے ہمارا مطلب سمجھنے میں آسانی ہوگی۔

(تمہید پشتو) ایران اور ہندوستان کی سرحد پر ایک خاص زبان بولنے والی قوم آباد ہے اسے فارسی میں پشتان اور ہندی میں پٹھان کہا جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس قوم میں مختلف عناصر مخلوط ہیں۔ ترک، ایرانی، یونانی، ارمنی، یہودی، عرب، سب قوموں کے آثار ملتے ہیں۔ لیکن جہاں تک ہم تحقیق کر سکے ہم اس قوم کو ہندی قدیم اقوام کا ایک حصہ مانتے ہیں اور پشتو کو سنسکرت کے فروع میں سے جانتے ہیں ....

تاریخ یمینی اور کامل ابن الاثیر کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پہاڑی اقوام اس وقت سلطان محمود کی فوج میں داخل ہوئیں جب سلطان نے جے پال راجہ لاہور کو شکست دے کر لغمان کے علاقہ پر قبضہ کیا جہاں اس وقت تک ہندو بت خانے موجود ہیں۔ باوجودیکہ یہ لوگ فوج میں داخل ہوگئے لیکن انھوں نے اسلام سلطان شہاب الدین غوری کے زمانہ میں قبول کیا ہے۔ پشتو گرامر فارسی کے مقابلہ میں ہندی سے زیادہ ملتی ہے۔ فعل کا مفرد و جمع بنانا فارسی میں فاعل کے تابع اور ہندی میں مفعول کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ پشتو اس معاملہ میں ہندی کے تابع ہے۔

پشتو حروف تہجی میں ایک ایسا حرف پایا جاتا ہے جسے بعض قبائل ش پڑھتے ہیں اور دوسرا اسے خ کی طرح تلفظ کرتے ہیں بعینہ یہ حرف ہندی حروف تہجی میں پایا جاتا ہے۔
پٹھانوں کے بعض قبائل ایسے ناموں سے مشہور ہیں جس نام کے ہندو قومیں ہند میں بستے ہیں جیسے بڑا ایچ۔ لودھی ایک ہی قبیلہ کاکڑ کے افراد جو قندھار میں بستے ہیں مسلمان ہیں اور جو بلوچستان میں رہتے ہیں وہ ہندو ہیں۔

افغانستان ۔ اصل میں اس پشتو بولنے والے علاقہ کا نام ہے پرانا لفظ اوگانستان معلوم ہوتا ہے اس علاقہ کا ایک حصہ سلطنت افغانیہ کا اساس قطعہ سمجھنا چاہیے؛ قندھار، قلات غزنی۔ غزنی۔ جلال آباد اس کے بڑے شہر ہیں۔ اس کا دوسرا حصہ بد قسمتی سے ہند کے برطانوی سلطنت میں داخل ہے جسے شمالی مغربی سرحدی صوبہ کہا جاتا ہے۔ ہم اسے پشتانیہ کہتے ہیں، پشاور، کوہاٹ، بنوں، ڈیرہ اسمٰعیل خاں اس کے بڑے شہر ہیں۔ سوات، باجوڑ، دیر اس کی سرحدی ریاستیں ہیں مہمند، وزیر، مسعود میں قومی حکومتیں ہیں۔

سلطنت افغانیہ ۔ کا مشرقی بازو افغانستان ہے۔ اور ہندوکش سے اوپر افغانی ترکستان ہے جس میں میمنہ، بلخ، بدخشان واقع ہیں۔ مغربی حصہ ہرات کا صوبہ۔ ایران کا ایک حصہ ہے جو افغانوں نے فتح کرلیا ہوا تھا۔ سلطنت کے اساسی نظام میں دہلی کے اکبر شاہی نظام کے دھندلے نشان ملتے ہیں۔ حکومت کی زبان فارسی ہے جس میں ہندی الفاظ کثرت سے مستعمل ہیں۔ اسی طرح ترکی الفاظ کی آمیزش بھی کافی موجود ہے۔

دارالسلطنت کابل ۔ دارالسلطنۃ میں ایرانی، افغانی، ترک، ہندی آباد ہیں۔ تجارت میں۔ زراعت میں سرکاری ملازمت میں سب قومیں شریک ہیں۔ اس وقت ہندی سے ہماری مراد ہندو اور سکھ ہیں جو افغانستان کی آبادی کا ایک اہم عنصر ہیں۔ ہم جس وقت کابل پہونچے اس وقت ان کے علاوہ دارالسلطنۃ میں اور بھی ہندستانی ملتے تھے۔ جنھیں ہم مختلف حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔

(الف)، ہندستان سے ہندو اور مسلمان تجارت کے لیے افغانستان میں کثرت سے آمد و رفت رکھتے ہیں۔ سندھی ہندو۔ اور پشاوری مسلمان ممتاز نظر آتے ہیں۔ پشاور میں مسلمانوں کا ایک حصہ انگریزی سرمایہ سے تجارت کرتا ہے۔ ان کے گماشتے افغانستان میں چھائے ہوئے ہیں۔ (ب)، بہت پرانے زمانہ سے لے کر افغانستان سے عربی زبان میں دینی تعلیم و تکمیل کے اکثر طالب علم ہند کے دینی مدارس میں آتے ہیں۔ یہ لوگ ہندوستانی زبان جانتے ہیں۔ ہندوستانیوں سے زیادہ مانوس ہو جاتے ہیں۔ (ج) جب سے امیر حبیب اللہ خاں نے یورپین علوم و فنون کے ترویج پر توجہ فرمائی اس وقت سے معلمین کی ایک جماعت کابل میں ہمیشہ موجود رہتی ہے یہ لوگ اکثر پنجابی ہیں۔ (د)، ان کے ساتھ پنجابی مسلمان طبیبوں کی بھی ایک جماعت ہے جن میں ایک آدھ اچھا ڈاکٹر ہے باقی سب کمپونڈر یا ڈاکٹر نما طبیب ہیں۔ انھیں بہت اچھی تنخواہیں ملتی ہیں اور پرائیوٹ معالجے بھی کافی روپیہ کما لیتے ہیں (ھ)، کابل میں چند ہندوستانی معلم ایک سیاسی سازش کے الزام میں مشروطیت پسند افغانوں کے ساتھ جیل میں مقید ہیں (و) پنجاب کے کالج کے طلبہ

[illegible] سفر کرتے ہوئے
پکڑے گئے۔ جو پولیس کی حفاظت میں کابل میں رہتے ہیں۔

اسی زمانہ میں میرے دو معزز دوست شیخ محمد ابراہیم سندھی ایم۔ اے اور مولوی محمد علی قصوری ایم اے۔ تعلیمی صیغہ میں ملازمت سے کے کابل پہونچ گئے۔ اور حبیبیہ اسکول میں کام پر لگ گئے۔ شیخ محمد ابراہیم کے ساتھ میں نے اپنا عزیز بھتیجہ عزیز احمد بن حبیب اللہ بھی کابل روانہ کر دیا تھا کہ وہیں حبیبیہ اسکول میں تعلیم پائے (نشان) اکتوبر ۱۹۱۵ء کے پہلے ہفتہ میں ہندوستانیوں کا ایک سیاسی مشن کابل پہنچ چکا ہے جس میں ترک و جرمن ممبر بھی شریک ہیں۔

اعلیٰ حضرت امیر حبیب اللہ خان (الامیر الشہید)

کی پرائیوٹ زندگی سے قطع نظر کر لی جائے تو انھیں "شاہ اصلاح پسند" کہنا چاہیے ہمیں اپنی اس رائے کے اظہار میں کوئی تامل نہیں کہ اگر امیر عبدالرحمان خان مرحوم کے بعد امیر شہید جیسا بادشاہ نہ آتا تو افغانستان میں موجودہ ترقی کا دور جاری نہ ہو سکتا۔ امیر حبیب اللہ خان نے دو مدرسہ حبیبیہ، حربیہ اور دو شفاخانے ملکی۔ نظامی نئے طریقہ پر بنائے۔ حبیبیہ سکول کا انتظام تمام تر ہندوستانیوں کے ہاتھ میں تھا۔ حافظ احمد دین بی اے اس وقت ہیڈ ماسٹر تھے۔ شیخ محمد ابراہیم ایم اے کو میں نے انھیں کی معرفت کابل میں بھجوایا تھا۔ ان کے ساتھ مولوی محمد علی قصوری ایم اے کو حافظ جی اپنی انتخاب سے لے گئے تھے۔ ۱

حربیہ سکول کا انتظام ترک افسروں کے قبضہ میں تھا اسی طرح ملکی شفاخانہ کا افسر ڈاکٹر منیر عزت بک بھی ایک شریف ترک تھا۔ اور نظامی شفاخانہ ایک ہندوستانی ڈاکٹر اللہ جوایا خاں کے پاس تھا۔ لیکن یہ دونوں شفاخانوں

یں ہندوستانی تھا - امیر حبیب نے ایک دو عالیشان عمارتیں بھی بنوائیں - جن میں کچھ یورپین انجینئر بھی کام کرتے رہے

ماشین خانہ - جو امیر عبدالرحمان خاں نے بنایا تھا - اس میں افغانی - ترک - ہندوستانی کام کرتے ہیں - امیر شہید نے اسے برقی قوت سے چلانے کا تمام سامان مہیا کر دیا ہے - جبل السراج میں برقی قوت پیدا کرنے کا اول درجہ کا محل طیار کر دیا لیکن اجنبی انجینئر کام کے تکمیل میں روڑے اٹکاتے رہے اعلیٰ حضرت امیر امان اللہ خان نے استقلال کے بعد چند روز میں کام جاری کرا دیا اور اس کی تکمیل کا سہرہ بھی ایک ہندوستانی مسلمان انجینئر کے سر باندھا گیا - امیر شہید نے سراج الاخبار جاری کرایا - جس کی ادارت کی باگ چند روز بعد سردار محمود طرزی کے سپرد کی گئی سراج الاخبار کے مطبع میں ہندوستانی اور مصری کام کرتے تھے -

امیر شہید کے اصلاح کام کا قطب مدار اگر سردار محمود طرزی کو قرار دیا جائے تو اس میں کوئی مبالغہ نہیں ہوگا میں ان کی زندگی کے نشیب و فراز سے اچھی طرح واقف ہوں - اصلاح افغانستان میں جس قدر ثابت قدمی سے اس مرد خدا نے جہاد کیا ہے - اس کی نظیر مشرقی اقوام میں بہت کم ملے گی -

امیر شہید نے شرفاء افغانستان کے گھریلو زندگی کی اصلاح و ترقی میں نمایاں کام کیے - کابل میں باہر سے آپ ایک گھر کو معمولی حیثیت میں پائیں گے - مگر اندر جا کے دیکھیں تو وہ نہایت صاف - منظم، آراستہ، ایک نمونہ ہوگا - امیر شہید اگرچہ اعلیٰ حضرت شاہ افغان کا لقب رکھتا تھا مگر سوائے ایک انگریزی قونصل کے (جو عموماً ایک پنجابی مسلمان ہوتا) ان کی دربار میں کسی دوسری دولت کا رسمی طور پر کوئی آدمی نہیں رہتا تھا، البتہ مسلمان حکومتوں کے معزز افراد کابل میں اپنی شخصی حیثیت سے ممتاز نظر آتے تھے -

(سرداران سلطنت افغانیہ)

امیر شہید کے چھوٹے بھائی سردار نصر اللہ خاں نائب السلطنۃ اور امیر شہید کے بڑے بیٹے سردار عنایت اللہ خاں معین السلطنت اور منجھلے صاحبزادے سردار امان اللہ خاں عین الدولہ امور سلطنت میں حسب مدارج شریک ہیں۔ مثلاً صوبہ کا حاکم نائب الحکومۃ امیر صاحب معین فرماتے تھے۔ اس کے ماتحت ہر ضلع کا حاکم سردار نائب السلطنت کے انتخاب سے مقرر ہوتا۔ شرعی فیصلہ کرنے کے لیے قاضی سردار معین السلطنت کی طرف سے مامور ہوتا۔ عمومی فوجی بھرتی جسے ہشت نفری کہا جاتا ہے سردار عین الدولہ سے تعلق رکھتی تھی۔ ان سرداروں کے بعد امیر عبدالرحمان خاں کے زمانہ سے ایک وزیر جو اس وقت معمر ہونے کی وجہ سے پنشن پاتے تھے سردار اعتماد الدولہ عبدالقدوس خاں ہیں۔ شاہی خاندان جس قبیلہ کے برانچ ہے اسے محمد زئی کہتے ہیں سردار اعتماد الدولہ باعتبار اپنی بزرگی کے تمام محمد زئیوں کے قومی بزرگ ہیں اس حیثیت سے خود امیر صاحب بھی ان کا احترام اپنے بزرگوں کی طرح ملحوظ رکھتے ہیں۔ مثلاً عید کے روز سلام کے لیے خود امیر صاحب ان کی خدمت میں جائیں گے۔ ان کے لیے سلام خانہ کی حاضری معاف ہے۔ سردار اعتماد الدولہ کے دو بھتیجے سردار محمد یوسف خاں اور سردار محمد آصف خاں مصاحبان خاص کے لقب سے ملقب ہیں۔ وہ امیر شہید کے مجلس میں ہمیشہ حاضر رہتے ہیں سردار محمد یوسف کے بڑے صاحبزادے سردار محمد نادر خاں سپہ سالار ہیں۔ مصاحبان خاص کے اولاد میں آٹھ دس نوجوان شائستہ باہمت کارکن ہیں کہ دوسرے درجہ کے تمام مناصب اکثر انھیں بھائیوں کے ہاتھ میں ہیں۔

امیر شہید کی حکومت اور ان کی اصلاحات کے کامیاب بنانے میں اس خاندان کا ممتاز حصہ ہے، اور اس کا کریڈٹ سردار محمد نادر خاں کو دینا چاہیئے۔ سردار محمد نادر خاں تمام ہندوستانیوں کے محسن و سرپرست

ہیں۔ لہذا میں تو خاص طرح پر ان کا ممنون ہوں۔ اگرچہ بظاہر میرا ان سے بہت کم تعلق رہا۔ لیکن میری ہر مشکل معاملہ میں وہ انتہائی مدد کرتے رہے اور لطف یہ ہے کہ کبھی اس کا اظہار کیا نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا۔ جس طرح سردار رنجیو طرزی ترکی معاشرت کے دلدادہ ہیں اسی طرح سردار محمد نادر خاں ہندوستانی معاشرت کے حامی ہیں۔ ان حضرات کے سوا، شاہی خاندان میں اور محمدزئی قبیلہ میں بہت سے سردار ہیں۔ دوسرے افغانی قبائل اور ایرانی خاندانوں کے شرفاء اس قدر زیادہ ہیں کہ ہندوستان کے کسی بڑے سے بڑے شہر میں بھی شرفاء کی اتنی مقدار مجتمع نہیں مل سکے گی۔

(باب اول)

کابل کی اہمیت اس میں کسی شک و شبہ کو گنجائش نہیں کہ ہندوستانی آزادی پسند لوگوں کے لیے عموماً سب سے زیادہ موزوں مرکز دارالسلطنت کابل ہے۔ اس ہندوستان کے متغلب حکمران ہم سے زیادہ جانتے ہیں۔ دہلی کی سلطنت گو آخر میں ضعیف ہو گئی تھی۔ لیکن اس پر ہاتھ ڈالنے کی ہمت انگریزوں میں اس وقت نہیں ہو سکی جب تک انھوں نے پنجاب پر قبضہ کر کے دہلی، کابل کا اتصال نہیں توڑ دیا۔ اس سے پہلے مرہٹوں کے قبضہ توڑنے کے لیے دہلی نے کابل و قندھار سے مدد حاصل کر لی۔ جس میں نجیب الدولہ کا خاص ہاتھ تھا۔ سیاسی مطالعہ کرنے والوں کے علم میں ایک طرح کا اضافہ ہوگا جب انھیں بتایا جائے کہ نواب نجیب الدولہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے خاص معتقدین میں سے ہیں اور ان کی سیاسی فلاسفی کو ایمان کا جزو اعظم سمجھتے ہیں۔

دوسری دفعہ جب انگریزوں نے دہلی پر تسلط جمایا تو حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی کے وابستگان حضرت

سید امیر شہید اور مولانا محمد اسماعیل شہید کے رفاقت میں اسی حجاب کو اٹھانے میں مصروف ہوئی۔ اور قندھار۔ کابل کے راستہ پشاور پہنچکر دو چار سال کوشش کرتے ہوئے شہید ہوئے۔

ہمارا کابل پہنچنا ہم نے جس حالت میں ۱۳۳۴ھ سے ہند میں زندگی بسر کی اس سے حکومت ہند خوب واقف تھی۔ ہمارا نصب العین تو کسی سے مخفی نہیں تھا۔ مگر ہمارا کام اتنا تیز نہیں رہا جس سے حکومت ہمیں معطل کرنا ضروری سمجھے۔ ہماری معیت میں جو لوگ، سی آئی ڈی، کے مقرر ہوئے ان سے ہمارا برتاؤ اچھا رہا۔ اس کا بھی ہماری آزادی میں کافی اثر ہے، کابل جانے کا فیصلہ ہم نے بعض اپنے استاد مرشد مربی حضرت مولانا شیخ الہند قدس سرہ کو راضی رکھنے کے لیے کیا تھا۔ ہم اپنی حیثیت و طاقت سے واقف تھے ہم نے بڑی بڑی امیدیں اٹھوا کر کبھی مسرور ہونے کی کوشش نہیں کی۔ ہم تصور نہیں کر سکتے تھے کہ کابل پہنچکر ایک سال سے کم عرصہ میں ہم اپنا مافی الضمیر کسی ذمہ دار افسر سے کہہ سکیں گے آخر اگر خوش ہوتے ہی تو فقط اس قدر کہ خدا نے اپنی بزرگ کا حکم مان کر ملک چھوڑنے کی توفیق عطا فرمائے۔

حضرت مولانا کا ذکر ہم ہر ایک دوست سے نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے بعض دوست جو اس خیال کے مؤید تھے کبھی ہم ان کا نام ذکر کر دیتے یا اپنا طبعی رجحان ایک مسلم حکومت میں جا بسنے کا ذرا تفصیل سے سنا دیتے اسی طرح ہم اپنے خاص دوستوں سے رخصت ہوئے۔

ہماری طرح کے آدمیوں کو ہندوستان کے حکمراں کس طرح کابل میں بدنام کرتے ہیں اس سے ہم واقف تھے۔ پہلے چند ہندوستانی ایک سیاسی سازش کے الزام میں محبوس ہیں۔ اس کا ہماری پوزیشن پر جو اثر پڑتا ہے وہ ہمارے سامنے ہے۔ ان حالات میں جس قدر احتیاط ملحوظ رکھنی چاہیے اس کا ہم نے

کافی انتظام کر لیا تھا۔ قندھار تک تو ہم بلا پاسپورٹ حکومت کی نگرانی میں پہنچ گیے اس وقت قندھار کے نائب الحکومۃ سردار محمد یونس خان تھے جو سردار اعتماد الدولہ کے چھوٹے بھائی ہیں۔ قندھار میں ہمیں دو شخص ایسے ملے جو نائب الحکومۃ سے اچھے تعلقات رکھتے تھے۔ ان میں سے ایک صاحب ہمیں سندھ میں مل چکے تھے۔ جب ہم امروٹ ضلع سکھر میں رہتے تھے وہ مولانا تاج محمد مرحوم کے خاص دوستوں میں سے تھے۔ دوسرے دارالعلوم دیوبند میں ہمیں ناظم جمعیۃ الانصار کی حیثیت میں دیکھ چکے تھے۔ اس لیے نائب الحکومۃ سے ہماری اچھی ملاقاتیں ہوئیں۔ بعض علمی مسائل کا تذکرہ بھی ہوتا رہا۔ اگرچہ ہمارا اشتغال مثنوی مولانا روم سے بہت کم رہا ہے۔ لیکن بفضلہ تعالیٰ اس امتحان میں بھی کامیاب رہے۔ نائب الحکومۃ نے ہمیں خاص راہداری دی۔ اور اول درجہ کے سفر کا انتظام کر دیا اپنے پرائیوٹ دوستوں کے نام تعارفی خطوط بھی دیے۔ غزنی سے ہم نے سردار محمود طرزی کو اطلاع بھیج دی اس لیے ان کا آدمی ہمیں شیخ محمد ابراہیم کے ہاں سب سے پہلے خوش آمدید کہنے کے لیے آیا وہ نوجوان سردار عبدالہادی خان تھا۔

<u>ہمارا تعارف</u> شیخ محمد ابراہیم کے قریب ایک لڑایہ کے مکان میں اترے اور ان کی توسط سے ان سب لوگوں سے مل لیے جن کے لیے ہمارے پاس خطوط تھے۔ ان میں قابل ذکر سردار سپہ سالار محمد نادر خان اور سردار محمود خان طرزی تھے۔ سردار سپہ سالار نے ہمیں ہر طرح امداد دینے کا یقین دلایا اور ہمارے قیام کابل میں جو مشکلات سرکاری طور پر پیدا ہو سکتے ہیں ان کے زائل کرنے پر اپنی تمام توجہ مصروف رکھی۔ احتیاط کا تقاضا یہی تھا۔ کہ ہم بظاہر سردار سپہ سالار سے اجنبی بنے رہیں اور اسی پر ہم نے عمل کیا۔ سردار سپہ سالار کے خاندان کا ہمارے شائخ سے خاص رابطہ چلا آتا ہے اس لیے ان

کا ہر قول و فعل اخلاص و محبت پر مبنی تھا۔

ترکی کے شریک جنگ ہونے کا اثر سردار محمود خاں طرزی پر نسبتاً بہت زیادہ تھا۔ اس لیے ہمارا رابطہ ان سے زیادہ تر ہو گیا۔ انھوں نے ہمیں سردار معین السلطنۃ سے ملایا اور ایک دن سردار کی معیت میں کھانے پر بلایا۔ اس سے ہمارا ذکر سلطنت کے تمام سرداروں میں پہنچ گیا۔ اس کھانے کے بعد پورا ایک دن ہم نے چھری کانٹا استعمال کرنے کی مشق میں صرف کیا اور بے تکلف کھانوں میں شریک ہوتے رہے۔

سلطنت افغانیہ میں شرعی فیصلوں کے اپیل کا ایک محکمہ ہے۔ جسے میزان التحقیقات الشرعیہ کہتے ہیں۔ اس محکمہ کا رئیس قاضی عبدالرزاق خاں تھا جو دارالعلوم کا تعلیم یافتہ ہے۔ حدیث حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہٗ سے پڑھے تھے۔ وہ سردار نائب السلطنت سے خاص طور پر وابستہ ہے جیسے سردار طرزی معین السلطنت سے اور سردار سپہ سالار اعلیٰ حضرت سے۔ حاجی عبدالرزاق خاں سے ہم چند روز بعد ملے پرانی علمی دوستوں کی یاد تازہ ہوتی رہی۔ ایک عجیب بات ہمیں وہاں نظر آئی کہ ہمارے اس سفر کے متعلق خاص طور پر ان کے پاس اطلاعات موجود تھیں۔ انھیں جب اچھی طرح اطمینان ہو گیا کہ میرا نام ہی عبیداللہ ہے تو بہت مسرور ہوئے۔

سردار نائب السلطنت کی حضور میں باریابی حاجی عبدالرزاق خاں چاہتے تھے کہ سردار نائب السلطنت سے ملائیں۔ معلوم ہوا کہ اس قسم کے غیر رسمی پولیٹکل معاملات سردار نائب السلطنت سے تعلق رکھتے ہیں۔ فقط رسمی معاملات اعلیٰ حضرت کے پیش ہوتے ہیں مگر ہم نے وہاں کے حالات کے مناسب انھیں مشورہ دیا کہ ہماری ملاقات سردار معین السلطنت کے توسط سے ہونی چاہیئے۔ اس انھوں نے پسند کیا

اور ہم نے ایک مختصر عریضہ لکھوالیا۔ جس میں ہم نے اپنی مقاصد کا بالاجمال ذکر کر دیا۔ اس کے بعد ایک روز مجھے سردار معین السلطنت اپنے ساتھ لے گئے۔ سردار نائب السلطنت تخلیہ میں ہم دونوں سے ملے اور دو گھنٹہ تک مفصل حالات سنے۔ سوالات کیے جواب سے مطمئن رہے یہ ایک طرح ہمارا امتحان تھا جس میں ہم بفضلہ تعالیٰ اچھے کامیاب رہے ہیں محسوس ہوا کہ سردار نائب السلطنت ہماری گفتگو سے محظوظ ہوتے ہیں۔ ان کی خواہش تھی کہ اس مذاکرہ کا خلاصہ ہم فارسی میں لکھ کر انھیں پیش کریں۔

میں اسلامی تاریخ کا عموماً مطالعہ کرتا رہا ہوں اور ہندوستانی تاریخ میں (سلطان عالمگیر اور اس کے عہد کا دور) میرا خاص مضمون ہے۔ چونکہ حضرت شاہ ولی اللہ کے خاندان کے ملی و سیاسی تحریکیں یہیں سے شروع ہوتی ہیں لیکن یوروپین طریقہ پر سیاسیات کے مطالعہ کا سامان میرے لیے زیادہ میسر نہیں آیا۔ اردو میں یا فارسی عربی میں اس نئی طرز کو سمجھنے کے لیے بہت کم کتابیں ملتی ہیں۔ اس لیے ایک عرصہ سے سیاسیات سے واقف تعلیم یافتہ کا اشتراک اپنے لیے ضروری سمجھتا ہوں۔ شیخ محمد ابراہیم نے تاریخ اور اقتصاد میں بمبئی یونیورسٹی سے ایم۔ اے۔ کیا ہے کابل آنے سے پہلے ہم نے سیاسی اشتراک پیدا کر لیا تھا اور وہ مجھ سے پہلے پہنچ کر حبیبیہ سکول میں ملازم ہو چکے تھے اس زمانہ میں فوقتاً وہ میرے مشیر تھے۔ میں نے بہت احتیاط سے اس پندرہ دن میں سات آٹھ صفحے لکھے۔ اور شیخ ابراہیم کو سنائے۔ انھوں نے بعض مفید اضافے کیے اور مضمون ہم نے سردار طرزی اور سردار معین السلطنت کی معرفت سردار نائب السلطنت کی طرف بھیجدیا۔ سردار نائب السلطنت ہماری طرز تحریر سے سمجھ گئے کہ جب تک ہمارے معاملہ خود اعلیٰحضرت فیصلہ نہیں کریں گے۔ ہم اسی قابل اطمینان نہیں سمجھتے۔ انھوں نے شاید

ایک ماہ بعد اعلیٰ حضرت کے حضور میں پیش کرنے کا انتظام کر دیا۔

اعلیٰ حضرت امیر حبیب اللہ خان شہید کے حضور میں باریابی ایک دن سردار نائب السلطنت نے مجھے اپنے قصر زمین العمارۃ میں بلایا اور عصر کے بعد وہیں اعلیٰ حضرت تشریف لائے۔ اعلیٰ حضرت اور سردار نائب السلطنت کے سوا اس کمرہ میں اور کوئی آدمی نہیں تھا۔ جس میں مجھے شرف باریابی حاصل ہوا۔ اس مجلس میں فقط دو کرسیاں اور ایک چھوٹی میز تھی۔ ایک کرسی پر اعلیٰ حضرت جلوہ فرما تھے اور دوسری پر مجھے بیٹھنے کا حکم نہایت محبت اور شفقت سے دیا گیا۔ سردار نائب السلطنت نے میرا وہ خزانہ اعلیٰ حضرت کے پیش کیا۔ آدھی گھنٹہ تک اعلیٰ حضرت اسے غور سے ملاحظہ فرماتے رہے آخر میں دعائیہ فقرات سے بہت متاثر ہوئے اور مختصر الفاظ میں پسندیدگی کا اظہار فرمایا اور کام کرنے کے لیے زبانی ایک خاص حکم ارشاد فرمایا۔ جس کی تعمیل میں اپنی امکان بھر آخر تک کرتا رہا۔ مجھے یہاں صراحتہً اعتراف کی ضرورت ہے اگر شیخ محمد ابراہیم مغفور کا صحیح مشورہ مجھے نہ ملتا تو میری بات اس قدر موثر نہ ہوتی اور میں اپنے آپ کو بحیثیت ایک ہندوستانی مسلمان کے دربار میں پیش نہ کرتا بلکہ ایک مسلم کی صورت میں متعارف ہوتا اور چند دنوں بعد مجھے پنا مسالک ہندوستانیت بنانے کی یقیناً ضرورت پیش آتی اور میں اپنے درجہ سے بہت کچھ چھوٹا سمجھا جاتا۔ اعلیٰ حضرت نے میری عزت افزائی سے یقیناً ہندوستان پر احسان کیا ہی لیکن نہ اس لیے کہ میں نے اپنے آپ کو ہندوستان کا عرضی نمائندہ بنا لیا تھا بلکہ اس میں زیادہ قابل عزت یہ بات سمجھی گئی کہ جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں مبالغہ سے قطعی پرہیز کیا گیا تھا۔ اعلیٰ حضرت کو جس قدر بذات خود واقفیت تھی ہمارا بیان اس کے قریب تھا۔

ایک محکوم ملت میں ایک متوسط طبقہ کا آدمی اور پھر وہ بھی مذہبی عالموں میں صحیح معلومات کا مالک ہے اور ایسے نازک موقعہ پر صداقت کا خیال رکھتا ہے اعلیٰ حضرت کے لیے اور اس سے پہلے سردار نائب السلطنت کے لیے واقعی ایک نادر اور مؤثر مثال تھی۔ میں اسی اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت سمجھتا ہوں۔ جس میں حضرت مولانا شیخ الہند کی دعا اور ان کی تعمیل حکم کی برکت کا بہت کچھ دخل ہے

فصل ہندوستانی مشن سے ملاقات | حرب عمومی کے شروع ہونے پر یورپ میں جس قدر ہندوستانی آزادی پسند موجود تھے وہ سب برلن میں جمع ہو گئے۔ اور انھوں نے جرمن گورنمنٹ کے اشتراک سے ہند کے آزادی کا کام شروع کر دیا برلین انڈین سوسائیٹی ان کی مرکزی جماعت تھی اس سوسائیٹی نے تجویز کیا کہ ایک مشن کابل بھیجا جائے جو افغانستان کو شمول حرب کی دعوت دے اس کے لیے مولانا برکت اللہ کو کرشنا ورما کی معرفت امریکا سے بلایا گیا۔

جس زمانہ میں سردار نائب السلطنت انگلینڈ گئی تھے۔ مولانا برکت اللہ کو اس وقت سے جانتے ہیں تجویز یہی تھی کہ مولانا برکت اللہ وفد کے رئیس بنائے جائیں گے۔ اسی دوران میں راجہ مہندر پرتاب سویزرلینڈ پہنچ گئے۔ برلین سوسائیٹی نے انھیں دعوت دی۔ لالہ ہردیال صاحب اس وقت سوسائیٹی میں منتظم تھے۔ اب دونوں صاحب کابل بھیجے گئے اور راجہ صاحب مشن کا رئیس قرار پائے۔ ان کے ساتھ جرمنی سے کپتان فون ہنٹنگ اور ترکی سے پوز باشی کاظم بک معاون کر دیے گئے۔ موسیو نیڈرمائر اور واگز ایران میں المانی کام کر رہے تھے۔ وہ بھی راستہ سے مشن میں شامل ہو گئے۔ یہ مشن ہم سے ایک ہفتہ پہلے کابل پہنچ چکا ہے اور ان کی مفصل ملاقاتیں ختم ہو چکی ہیں۔ ہم جب اعلیٰ حضرت کے حضور میں پیش ہوئے

اس کے بعد ہمارے لیے مشن کے ہندوستانی ممبروں سے ملنے کی اجازت مل گئی اور
ہم ان سے اچھی طرح مل سکے۔ ہمیں معلوم ہوا کہ ہندستانی معاملات میں ہماری اور ان کی نقطہ
نظر میں کسی قدر فرق ہے اسی طرح مشن کے جرمن ممبروں سے ہماری ملاقاتیں ہوئیں۔ اپنی نقطہ نظر
کی توضیح کے لیے ہم ایک طویل زمانے تک تبادلہ خیالات کرتے رہے۔ اس زمانہ میں ہمارا ترجمان
ہندوستانی نوجوان تھا جسے ان لوگوں نے اپنا پریذیڈنٹ منتخب کر لیا تھا۔ اس کا نام عبدالباری ہے
وہ لاہور گورنمنٹ کالج سے ایم اے کلاس میں پڑھتا ہوا چلا آیا تھا۔ شیخ محمد ابراہیم چونکہ جیبیہ سکول
میں ملازم تھے، اس لیے ان کو سیاسی مجالس میں عام طور پر شامل ہونے کے موقع بہت کم ملتے تھے۔
ہماری ملاقات سے پہلے مشن کے ہندوستانی و جرمن ممبروں میں اختلاف پیدا ہو چکا تھا۔
ہمارے ہندوستانی دوستوں کے نظریات یورپین سائیکالوجی کے لیے نہایت دلفریب تھے۔ ترک اور
جرمن جب تک برلن اور استانبول میں رہے ان نظریات کی بہت قدر کرتے رہے۔ لیکن کابل
میں تو عملی کارروائی کے لیے آئے تھے۔ اس میں مشن کے پریذیڈنٹ یا مولانا برکت اللہ کوئی زیادہ
رہنمائی نہیں کر سکتے تھے۔ ان کو عمر بھر افغانستان۔ صوبہ سرحدی، پنجاب، سندھ، بلوچستان
کو نقشہ میں دیکھنے سے زیادہ موقع نہیں ملا تھا۔ مشن کے ممبر شروع میں ہم سے اخلاص سے نہیں
ملے مگر بالتدریج ان کا خیال ہمارے متعلق اچھا ہو تا گیا۔ ہماری ساری عمر سندھی مغربی ہند میں
گزری اور اسی ادھیڑبن میں ہر کوہ سے ملتے رہے۔ ہمارے پاس بعض ایسے معلومات بھی تھیں
جو کابل میں فوجی نقطہ نظر سے بہت قیمتی سمجھی جاتی ہیں۔ اس طرح آہستہ آہستہ ہماری رائے غالب ہونے لگی۔

اس کے بعد ہمارے لیے مشن کے ہندوستانی ممبروں سے ملنے کی اجازت ہو گئی اور ہم ان سے اچھی طرح مل سکے۔ ہمیں معلوم ہوا کہ ہندوستانی معاملات میں ہماری اور ان کی نقطہ نظر میں کس قدر فرق ہے۔ اسی طرح مشن کے جرمن ممبروں سے ہماری ملاقاتیں ہوئیں۔ اپنی نقطہ نظر کی توضیح کے لیے ہم ایک طویل زمانے تک تبادلہ خیالات کرتے رہے۔ اس زمانہ میں ہمارا ترجمان ہندوستانی نوجوان تھا جسے ان لوگوں کے پیانہ پر پریذیڈنٹ منتخب کر لیا تھا۔ اس کا نام عبدالباری ہے۔ وہ لاہور گورنمنٹ کالج سے ایم اے کلاس میں پڑھتا ہوا چلا آیا تھا۔ شیخ محمد ابراہیم چونکہ حبیبیہ سکول میں ملازم تھے۔ اس لیے ان کو سیاسی مجالس میں عام طور پر شامل ہونے کے موقع بہت کم ملتے تھے۔

ہماری ملاقات سے پہلے مشن کے ہندوستانی و جرمن ممبروں میں اختلاف پیدا ہو چکا تھا۔ ہمارے ہندوستانی دوستوں کے نظریات یورپین سائیکالوجی کے لیے نہایت دلفریب تھے۔ ترک اور جرمن جب تک برلن اور استانبول میں رہے ان نظریات کی بہت قدر کرتے رہے۔ لیکن کابل میں تو عملی کارروائی کے لیے آئی تھے۔ اس میں مشن کے پریذیڈنٹ یا مولانا برکت اللہ کوئی زیادہ رہنمائی نہیں کر سکتے تھے۔ ان کو عمر بھر افغانستان۔ صوبہ سرحدی، پنجاب، سندھ، بلوچستان کو نقشہ میں دیکھنے سے زیادہ موقع نہیں ملا تھا۔ مشن کے ممبر شروع میں ہم سے اخلاص سے نہیں ملے مگر بالتدریج ان کا خیال ہمارے متعلق اچھا ہوتا گیا۔ ہماری ساری عمر سیاسی مغربی ہندمیں گزری اور اسی ادھیڑبن میں ہر کروٹ سے ملتے رہے۔ ہمارے پاس بعض ایسے معلومات بھی تھیں جو کابل میں فوجی نقطہ نظر سے بہت قیمتی سمجھی جاتی ہیں۔ اسی طرح آہستہ آہستہ ہماری رائے غالب ہونے لگی۔

اس اختلافِ عقائد سے قطع نظر ہم نے ہندوستانی ممبروں کے احترام و اعزاز میں کوئی فرق نہیں دیا۔ اس لیے روز بروز ایک دوسرے سے قریب ہوتے گئے۔

باب (۲) راجہ صاحب سے تبادلہ خیالات کرنے پر ہمیں ایک ناگوار حقیقت کا علم ہوا۔ ہم ہندستان میں بھی اس سے کسی قدر واقف ہو چکے تھے۔ مگر اہمیت کا صحیح احساس نہیں ہوا۔ اب ہمیں اس کے اثر اور وسعت کا حقیقی علم حاصل ہوا۔ ناظرین کو اس مسئلہ میں ہمارے تبدلات سمجھنے میں آسانی ہو۔ ہم کسی قدر گذشتہ واقعات کا ذکر کرتے ہیں۔ میری طالب علمی کا پہلا زمانہ تو ایسا ہے کہ اس وقت میں سوائے اسلام اور مسلمانوں کے اور کسی چیز کی ہستی نہیں مانتا تھا۔ لیکن جب میرا مطالعہ پختہ ہوا تو مجھے ہندستانیت یا ہندو مسلم اتحاد کا خیال اور اس کی ضرورت زور سے محسوس ہونے لگی۔ ہاں عمل حصہ لینے کے لیے مجھے اس زمانہ میں کوئی موقعہ نہیں ملا۔ اس بعد جب مسلمانوں کے مرکزی جماعتوں سے میرا تعارف ہوا تو میں نے مناسب طور پر اپنے بزرگوں اور دوستوں کو اس طرف توجہ دلانی شروع کی۔ اور میری مسرت کی انتہا نہیں رہی جب مجھے امید سے زیادہ کامیابی نظر آئی۔

اس ضروری مسئلہ کے محرکات میں جس وقت ناظم جمعیۃ الانصار دیوبند تھا۔ میرے ایک سندھی دوست پروفیسر جیوت رام کرپلانی دیوبند تشریف لائے۔ وہ دارالعلوم دیکھنا چاہتے تھے۔ ایک ہفتہ تک میرے مہمان رہے۔ انھیں پوری آزادی سے دارالعلوم کی سیر کرائی۔ آخر میں وہ دارالعلوم کی بہت تعریف کرتے تھے کہ ہند کے مستقبل میں جو چیزیں کارآمد ہو سکتی ہیں وہ اسی قسم کے کام ہیں۔ اور دارالعلوم کی خدمات قابل تعریف اہمیت رکھتے ہیں۔ اس پر میں نے سوال کیا کہ کیسے پروفیسر صاحب

ہماری ضرورت ہے یا نہیں ان کا جواب تھا " بالکل نہیں " آپ اگر ضرورت سمجھیں تو ہمارے ساتھ ہو جائیں ورنہ میدان ہمارا ہے ہم اپنا کام خود کریں گے۔ اس جواب کا اثر مجھ پر ظاہر ہے کہ اچھا نہیں ہوا۔ بلکہ اس نے مجھے ایک طرح بیقرار کر دیا چند روز کے بعد ہماری مؤتمر الانصار کا اجلاس مراد آباد میں قرار پایا۔ بحیثیت ناظم مؤتمر الانصار مجھے شرفاء مراد آباد سے ملاقات کے موقع ملے۔ ہمارا جلسہ بفضلہ تعالیٰ کامیاب رہا۔ علیگڈھ کے پروفیسر جلال الدین صاحب (جو ہمارے کاموں کو ابتدا سے اچھی طرح دیکھ رہے تھے) سے میں نے مؤتمر کی نسبت سوال کیا۔ انھوں نے بہت تعریف کی۔ اس پر میں نے وہی سوال ان سے دہرایا: کیوں صاحب ہماری ضرورت ہے یا نہیں۔ پروفیسر نے نہایت محبت آمیز متانت سے جواب دیا " آپ کے سوا تنہا ہم کچھ نہیں ہیں۔"

اس جواب کا مجھ پر گہرا اثر آیا اور میں نے دل میں اپنی آپ کو اور اپنی ساتھ اپنے دوستوں کو سخت ملامت کی کہ تعلیم یافتہ جماعت سے ہم کیوں کچھے رہے۔ ساتھ ہی ہندو مسلم اتحاد کا مکمل پروگرام میرے سامنے آ گیا۔ اس کی پہلی کڑی قدیم و جدید نوجوان کا سمجھوتہ ہونا چاہیے۔ پھر دوسرا قدم اٹھانا اسی قدر مشکل نہیں رہے گا۔

تمہیدی مقدمات کی تکمیل پرانے اور نئے خیال کے مسلمانوں میں عمل نزاع کیا ہے میں اسے اچھی طرح جانتا تھا۔ علماء برداشت نہیں کر سکتے کہ عام مسلمانوں کی رہنمائی کا منصب ان کے ہاتھ سے نکلے اور تعلیم یافتہ طبقہ لیڈرشپ کا مدعی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ علماء کی امارت میں وہ کوئی کام نہیں کر سکیں گے مگر میں نے اپنے دل میں فیصلہ بنا لیا کہ سب سے پہلا کام یہ ہونا چاہیے کہ اہل علم لیڈرشپ کے ادعاء سے

دست بردار ہو جاتے ہیں۔ اور تعلیم یافتہ طبقہ لوگوں میں عام طور پر یہ احساس پیدا کر دیا جائے کہ وہ اہل علم کی خصوصیت کی صحیح قیمت کو نہ بھولیں۔ میرے استاد حضرت شیخ الہند تغمدہ اللہ بغفرانہ نے میرے خیال کی اس طرح سے داد دی کہ وہ پہلے سے اس کے لیے تیار بیٹھے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ جب مولانا محمد علی مرحوم گورنر دہلی کے آرڈر سے دیوبند تشریف لے گئے تو حضرت مولانا خود ان سے ملنے کے لیے ان کی قیام گاہ پر گئے۔ اسی وقت سے ہمارے امام نے مولانا محمد علی مرحوم کو اپنا لیڈر تسلیم کر لیا۔ میں اس وقت دیوبند میں نہیں تھا۔ اور نادان لوگوں نے حضرت کے اس تقدم پر نکتہ چینی بھی کی تھی۔ خدا بھلا کرے ڈاکٹر مختار احمد انصاری کا جو علماء دیوبند اور تعلیم یافتگان علیگڑھ کے ملانے میں ایک مضبوط کڑی ثابت ہوئے وہ جب ہلال احمر کا وفد لے گئے اس میں علماء دیوبند بھی شریک ہوئے اور اسی کام کو مکمل کرنے والے ہمارے مسیح الملک مغفور تھے۔ میں جب دہلی آیا۔ اور مسیح الملک کی سرپرستی میں نظارۃ المعارف قائم ہوئی تو اس میں نواب وقار الملک اور حضرت شیخ الہند دونوں ایک درجہ پر شریک تھے۔

ہندو مسلم اتحاد اس مرحلہ کے طے ہونے پر مسیح الملک اور ڈاکٹر انصاری نے دہلی میں اس کام کو عملاً شروع کر دیا۔ اور اس میں اعلیٰ درجہ کی کامیابی ہوئی۔ اور مولانا محمد علی قومی لیڈر بن گئے۔ میں ہندو دوستوں کے خیالات جانچتا رہا۔ اس میں بہت بڑا انقلاب پیدا ہو گیا۔ پروفیسر کرپلانی دوسرے مرتبہ دہلی بھی تشریف لائے اس دفعہ ان کی ذہنیت اور تھی۔ انھوں نے مجھے دعوت دی۔ اگر میں چاہوں تو تمام ہندو مؤسسات کا مطالعہ کر سکتا ہوں اور وہ میرے لیے انتظامات کر دیں گے۔ ان واقعات سے میں اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ اس قسم کی غلط فہمی ہندوؤں میں کافی طور پر موجود ہے لیکن وہ ناقابل علاج نہیں

تھوڑی توجہ سے دور ہو سکتی ہے۔ میں یہ سمجھتا تھا کہ تمام یورپ و امریکہ میں یہ پروپگنڈا صرف پھیلا ہے اور ہمارے ہندو بھائی جب ہندوستانیت کا تعارف کراتے ہیں تو یہ بتا دیتے ہیں کہ ہندوستانی عورتیں کے وقت رام رام کہا کرتے ہیں۔

ہندوؤں کی ایک غلط فہمی تاریخ پڑھ کر ہندو نوجوان یہ نظریہ قائم کر لیتا ہے کہ ہندو اصل میں ہندوستانی ہے اور مسلمان انگریزوں کی طرح ایک بیرونی فاتح ہے۔ اس لیے جب وہ ہند کو بیرونی لوگوں سے صاف کرنے کا خیال بناتے ہیں۔ تو اس میں مسلمان کو بھی بیرونی فرض کر لیتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ مسلمان شرفاء کی ایک بڑی تعداد عرب و عجم کے بزرگوں کی اولاد ہے اور ان کی زبان نے بعض اوقات ایسے کلمات بھی نکل جاتے ہیں جس سے ہندو نوجوان کو اپنے تخیل کی ایک سند مل جاتی ہے۔

مجھے یقین ہے کہ ناظرین میری شخصیت کے متعلق ناواقف نہیں ہوں گے کہ میں ایک ہندو گھر میں پیدا ہوا۔ اور ایک ہندو نومسلم کی کتاب تحفۃ الہند جو ایک برہمن کے واسطہ سے مجھی ملی۔ اس کے مطالعہ کے بعد اسلام کی حقانیت پر یقین کر کے سولہ برس کی عمر میں گھر بار خویش و اقربا چھوڑے اور ساڑھے تین سال کے عرصہ میں علوم دینیہ کی تکمیل کر کے دارالعلوم دیوبند سے سند فضیلت حاصل کی۔ میں علمی تحقیقات سے اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ہندوستانی مسلمانوں کی عام آبادی خصوصاً طبقہ سافلہ کاشتکار و مزدور ہندو بزرگوں کی اولاد ہے جو اسلام قبول کر چکے ہیں اور جو بزرگ فاتحانہ ہند میں داخل ہوئے اور وہ یہیں کے ہو کر رہ گئے اور جو خاندان اس نئے مذہب اور تمدن کو ہند میں قائم کرنے میں کوششیں

کرتے رہے ہیں ان کی اولاد اول درجہ کی ہندوستانی ہے۔ ہندوؤں قوموں کا نومسلم اور اسلام فاتحین کے اولاد فیصلہ کرنا ایک نہایت حماقت آمیز جہالت ہے۔ ہمارے بھائیوں کو بہت جلد اس غلط فہمی سے پاک ہونا چاہیے۔ میرا یقین ہے کہ اسلام سے بہتر انسانیت کے لیے کوئی مذہب کوئی فلسفہ کوئی تمدن کوئی قانون میسر نہیں آسکتا۔ اس لیے ہندوستانیوں کو اسی عزت سے مان لینا چاہیے۔ لیکن اگر بدقسمتی سے ایسا نہیں ہو سکتا تو ہم نومسلم ایسے بھی کیا گئے گزرے ہو گئے کہ اپنی آبادی کے تناسب سے اپنے مذہب کی عزت تمام بھائیوں سے نہ منوالیں۔ ایک ہندوستانی اسلام قبول کرنے کے بعد اپنی آپ کو زیادہ بہادر زیادہ شریف تصور کرتا ہے۔

(کانگریس کے ایک لیڈر کی رائے)

مسلم لیگ کا ڈپوٹیشن جب شملہ ہو گیا تو مسٹر گوکھلے نے مسلمانوں کو اپنی تعداد سے زیادہ نمائندگی مانگنے پر ایک آرٹیکل لکھا تھا۔ میں نے اس کا ترجمہ پڑھا ہے۔ اس سے میری دل میں یہ بات ٹھیک طور پر بیٹھ گئی کہ واقعی ہمیں انصاف کی رو سے اس قدر نمائندگی پر راضی ہو جانا چاہیے جس قدر شری کایت کرشن گوپال گوکھلے ہمارے لیے مانتے ہیں۔ میں نے راجہ صاحب سے اس کا ذکر کیا کہ جن صوبوں میں مسلم آبادی زیادہ ہے وہاں کوئی کارروائی مسلمانوں کے فیصلہ کے بغیر نہیں ہونی چاہیے۔ اسی طرح یہ مسئلہ بیرونی لوگوں کے سامنے نہیں آیا تھا۔ بلکہ ہم نے اعظم کو اکائی مان کر میجارٹی کے فیصلہ کو وہ لوگ ہندوستانی چاہتے ہیں۔ انھوں نے ہماری مدلل بات سنی اور اعداد و شمار پر غور کیا تو ان کی رائے ہمارے موافق ہو گئی۔ جرمن کیپٹن نے کہا کہ

ہماری گورنمنٹ نے ایک دفعہ غلطی کی ہے دوسرے دفعہ نہیں کرے گی۔

راجہ مہندر پرتاپ صاحب | ہمارے راجہ صاحب ہوشیار ہیں اور اسی کا پروپگنڈا کرتے ہیں لیکن اصلی انسانیت کا معیار ان کی ذہن میں ایک کرشن ستانی سے اونچا نہیں ان کی ہندوستان میں میری ابتدائی مطالعہ کے مقابل مسلمانوں کی کوئی ہستی نہیں تھی۔ کابل میں مہمانوں سے روا داری ایک مرض کے درجہ تک ترقی کرچکی تھی۔ وہ مہمانوں کی بات صریحاً غلط سمجھ رہے ہیں مگر اپنے آپ کو جاہل ظاہر کرکے مہمان کی خوشنودی حاصل کرنا ضروری جانتے ہیں۔ عام مجلسوں میں ان کی غلط باتوں کے بے شاعرونہ کے مقولے تائید میں لاہش کریں گے۔ اس سے مہمان سمجھ رہا ہے کہ میرے پروپگنڈہ کا خوب اثر ہو رہا ہے۔ ہمارے راجہ صاحب بھی اس غلط فہمی میں کافی زمانہ تک مبتلا رہے۔ یہ کہنا بیجا نہیں کہ میرے تبادلہ خیالات نے راجہ صاحب کو مجبور کیا کہ ہندوستانی معاملات میں وہ صحیح طور مسلمانوں کو شریک کریں۔ اور میں ان کے لیے ویسا نرم اور میٹھا ثابت نہیں ہوا جیسے مولانا برکت اللہ مرحوم۔ اس کے بعد ہماری اور راجہ صاحب کی اکثر معاملات بحث سے طے ہوتے رہے اور میں نے ان کے معاملہ کو بھی پروفیسر گرپلانی کی طرح معمولی تصور کیا۔ یعنی ایک غلط فہمی تھی۔ اور اول کی روشنی میں اس کی درستی کر دی گئی۔

راجہ صاحب کا حملہ | مگر واقعہ ایسا نہیں تھا۔ انھوں نے ہندو مہاسبھا کا نظریہ اسی وقت قبول کرلیا یا زیادہ صحیح طور پر کہا جائے تو انھوں نے اپنی قلبی فیصلہ کو عملی صورت دینا

شروع کردی۔ یعنی آریہ سماج کو ہراول بناکر لالہ ہردیال کے نام سے مسلمانوں پر حملہ کر دیا۔ انہوں نے کافی محنت کے بعد اپنے بھائی سے سوئٹزرلینڈ میں ملاقات کی صورت نکالی اور انہیں نشیب و فراز سمجھاکر واپس کر دیا۔ راج کمار شاردھا کا لاہور میں جلوس اور پنڈت مالوی جی کا لالہ رای لاجپت رائے اور سوامی شردھانند سے میل مل کر انہیں معافی کے لیے طیار کرنا معمولی واقعہ نہیں ہے ہمارا خیال ہے کہ اس میں راجہ صاحب کا ہاتھ کام کر رہا ہے۔

لالہ لاجپت رای کی ملاقات استنبول میں | راجہ صاحب فرماتے ہیں کہ حکومت ہند کی کتاب سوئٹزرلینڈ کے سفر میں چرائی گئی ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ وہ بھی جناب پنڈت جی تک پہنچ گئی یا پہنچادی گئی ہے۔ اس سے جس قدر معلومات حاصل ہوئیں ان کا عام پروپگنڈا آسان نہیں فوراً سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسقدر گہری واقفیت کیسے معلوم ہوئی۔ ہمارا خیال ہے کہ راجہ صاحب کی عزت محفوظ کرنے کے لیے لالہ لاجپت رای ہم سے ملے۔ اس کے بعد ہر ایک بات ہمارے نام سے کہی جا سکتی ہے۔ ہماری ملاقات سے لالہ جی نے اور بھی فائدہ حاصل کرنا چاہا۔ جس میں افسوس ہے کہ انھیں زیادہ نقصان اٹھانا پڑا۔ یہاں یہ جملہ معترضہ ہے۔

جرمن ممبروں کی شکایت | مفصل ملاقاتوں سے ہمیں یہ معلوم ہوا کہ مشن کے ہندوستانی ممبر اور جرمن ممبر وہ یکجہتی جو ایسے سیاسی مہمات کے لیے ضروری ہے قائم نہیں رکھ سکے۔ ہندوستانی ممبر سارا الزام جرمن ممبروں پر تھوپتے ہیں۔ لیکن جرمن شکایت کرتے کہ برلن و استنبول میں جو سبز باغ دکھائے گئے۔ اس کا عشر عشیر بھی یہاں نظر نہیں آتا۔ اب مشن کا مقصد جو بیان کیا جاتا ہے۔

الغایت چونکہ مشن نے اس کے موافق کوئی تیاری نہیں کی۔ راجہ صاحب کو جب میں نے ان باتوں پر متنبہ کیا۔ تو فرمایا جرمن چانسلر نے بھی مجھے اس طرف توجہ دلائی تھی۔ اور میرے لیے آسانی پیدا کرنی چاہی مگر میں نے خلاف شان سمجھکر انکار کر دیا۔

(ہندوستانی مشن کا مقصد)

جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں فقط اس قدر تھا کہ جرمنی ترکی اتحاد میں افغانستان شمولیت قبول کرے تو مالوی جی کا ایک نمایندہ اس سے واقف ہوتا رہے اور جہاں تک ممکن ہو ہندوستان کے سرحد سے اس مصیبت کو نامتاثر رہے۔ سرحدی معاملات میں جو پوزیشن شاہ افغانستان کو حاصل ہے اس میں مہاراجہ نیپال کو شریک کرنے کی کوشش کرے۔ انڈین سوسائٹی برلن نے پوری دانشمندی سے اس بند و تحریک کو ہندستانیت کا رنگ دینے کے لیے مولانا برکت اللہ مرحوم کو بھی برائے بیت اس میں شامل کر دیا۔

مولانا برکت اللہ مرحوم کی شمولیت کو جس قدر ہم بے معنیٰ دکھلا رہے ہیں۔ اس کا مولانا کی شخصیت سے کوئی تعلق نہیں بلکہ یہ مسلمانوں کے اس غفلت کی سزا ہو۔ اپنے آپ کو اقلیت میں فرض کرکے اکثریت کے رحم پر زندگی بسر کرتے ہیں۔ جب ایک شخص کے ذہن میں ٹھونس دیا جائے کہ تم اس بت کے اجازت نہ ہونے کی صورت میں کوئی کام نہیں کر سکتے۔ تو اس شخص کے بیکار ہوتے میں کیا کلام ہو سکتا ہے۔

میں اپنا مطلب واضح کرنے کے لیے ایک دو مثالیں لکھتا ہوں۔ مولانا محمد علی مرحوم اور

مولانا ابوالکلام آزاد جب اپنا اختیار مہاتما گاندھی کے سپرد کرتے ہیں تو کیا وہ اپنی قربانیوں سے مستفید ہو سکتے ہیں۔ یا ڈاکٹر انصاری اگر سوامی شردھانند کے ساتھ وابستہ کر دیا جائے، تو ان کی محنت کوئی نتیجہ دے سکتی ہے۔ اسی طرح مولانا برکت اللہ معصوم اگر راجہ صاحب سے اختلاف کرکے اپنا کام جاری نہیں رکھ سکتے تو ان کی ہاں میں ہاں ملانے کے سوا چارہ ہی کیا ہے۔

(باب ۳)

جنود اللہ جب ہم سردار نائب السلطنت سے مل چکے تھے تو وہ ہندستانی تعلیم یافتہ نوجوان جو لاہور سے یاغستان ہوکر کابل اس ارادہ سے پہنچے تھے کہ ترکی جاکر وہ جنگ میں شریک ہوں گے لیکن کابل میں روک دیئے گئے تھے۔ انھیں پولیس کی حراست سے آزاد کر دیا گیا۔ اور ان کے رہنے کے لیے وہی گھر تجویز ہوا جس میں ہم رہتے تھے۔ ہماری خواہش تھی کہ وہ ترکی جانے کا خیال چھوڑ دیں اور کابل میں ہمارے ساتھ رہکر حکومت کے مصلحت جس قدر اجازت دیتے تھے۔ اسی قدر کام میں معروف رہیں وہ جب لاہور سے نکلے تھے تو منتظم شکل میں سفر کر رہے تھے۔ مگر کابل میں لاہوری نوجوانوں کے ساتھ چند پشاوری نوجوان بھی شامل ہوگئے اور ان میں اختلاف شروع ہوگیا۔ بیکاری میں آہستہ آہستہ لاہوری جماعت کے افراد بھی کسی قدر مختلف ہو رہے تھے۔ ہمیں جب یہ حقیقت معلوم ہوئی تو سب سے پہلے ان کے پرانے نظام کو تازہ کرنے کی کوشش شروع کی۔ اور ایک نوجوان عبدالباری بی اے جماعت کا رئیس منتخب ہوا۔ ہمارا تعلق اس جماعت سے اس رئیس کے توسط سے تھا۔ چونکہ ہندوستانیوں کی ایک جماعت سیاسی سازش کے الزام میں محبوس تھی۔ اور وہ لوگ

افغانستان کے محکمہ تعلیمات سے تعلق رکھتے تھے۔ اس لیے ہم افغانستان میں اپنا اصلی دلچسپ کام
تعلیم بھی جاری نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن جب یہ نوجوان ہمارے ساتھ رہنے لگے تو ہمیں دہلی کے نظارۃ
المعارف کا لطف آنے لگا۔ ان کے متعلق ہمیں کسی احتیاط کی ضرورت نہیں تھی۔ اس جماعت میں کم
از کم دس آدمی ایسے تھے جو ۳ سال سے زیادہ کالج میں پڑھ چکے تھے۔ انھیں ہم نے علحدہ کر لیا۔
اور کسی قدر مذہبی اور عام سیاسی اصول پر ان سے مذاکرات ہوتے رہے۔ اس میں شیخ محمد ابراہیم اور
مولوی محمد علی قصوری بھی شریک رہے۔ اس عرصہ میں ہمارے بعض دوست دیوبند سے بھی پہنچ گئے۔ جن
میں مولانا منصور انصاری تھے۔ جمعیۃ الانصار میں ہم دونوں ساتھ کام کر چکے تھے۔ اور مولانا سیف الرحمٰن
دہلی سے یاغستان ہوتے ہوئے کابل پہنچ گئے۔ مولانا سیف الرحمٰن اصل میں قندھاری افغان ہیں۔
ان کے آبا و اجداد پشاور کے پاس رہنے لگے انھوں نے مولانا رشید احمد گنگوہی سے حدیث پڑھی۔
اور زیادہ عرصہ ٹونک میں پڑھاتے رہے۔ آخر میں دہلی کی مدرسہ فتحپوری کے مدرس اول تھے
جب حضرت مولانا شیخ الہند کے مشورہ سے انھوں نے یاغستان کی طرف ہجرت کی اور حاجی ترنگ زئی
کی معیت میں کچھ عرصہ جہاد میں شریک رہے اور پھر کابل تشریف لائے۔ سرحد میں مولانا ولایت علی
کی جماعت مجاہدین پرانی حکومت موقتہ کی یادگار موجود ہے۔ ان کے وکیل مولانا محمد بشیر جو لاہور کے
اہل حدیث جماعت کے معزز کارکن تھے۔ وہ ہجرت کر کے جماعت مجاہدین میں رہتے ہیں۔ نوجوانوں کی
ہجرت میں ان کا خاص کام تھا وہ بھی اپنی جماعت کے فرائض انجام دینے کے لیے کابل پہنچے ان
لوگوں کے مشورے سے ہم نے کام کرنے والوں کی ایک جماعت بنائی جسے "**جنوداللہ**" کہا جاتا تھا۔

اس میں اگر کچھ عسکریت تھی تو اسی قدر جتنی سالویشن آرمی میں موجود ہے۔ اس نظام سے ہم نوجوانوں کی باہمی رقابتوں کو دور کرسکے۔ اور انھیں مفرور طالب علموں کے گروہ نام سے نجات دلانے میں کامیاب ہوئی۔ سرحد میں حاجی ترنگ زئی کے آنے پر ایک افغان مجاہدین کی جماعت بھی پیدا ہوگئی۔ حاجی ترنگ زئی چونکہ حضرت مولانا شیخ الہند کے دوستوں میں سے تھے ان کے ساتھیوں میں بہت سے لوگ دیوبند میں پڑھے ہوئے تھے۔ اس لیے ان کی وکلا جب کابل آئے تو وہ بھی جنود اللہ میں شامل ہوگئے۔

حکومت موقتۂ ہند ہندستانی مشن کو اپنے مطالب میں کامیابی نہیں ہوئی۔ اعلیٰ حضرت اپنے ملک کو جنگ میں دھکیلنا پسند نہیں کرتے تھے۔ اور اگر انگریزوں سے انھیں بہت کچھ مراعات کی توقع تھی اس کے مقابل فریق ثانی کوئی تسلی بخش پروگرام نہیں بتا سکا۔ اور ممبروں کا اختلاف سونے پر سہاگ کا کام دے گا۔ ہمارا خیال ہے کہ مستقبل ہند کے متعلق ہمارے نظریات چونکہ مشن کے ممبروں سے پورے نہیں ملتے تھے اس لیے بھی ہمیں دربار میں جلدی بڑھنے کا موقع مل گیا۔ حکومت نے مشن کے ممبروں کو آخری جواب دینے سے پہلے ہمیں ان سے ملنے کے سامان بہم پہنچا دئی۔ جس سے ان کے خواب کو ایک طرح مختلف تعبیرات سے پریشان کرنے کی کوشش کی گئی۔ مشن کے جو گفتگو اعلیٰ حضرت سے ہوتی وہ حرف بحرف برٹش قونصل کے ذریعہ وایسرائے کو بھیجدی جاتی۔ اس کے معاوضہ میں انگریزوں نے کافی روپیہ اعلیٰ حضرت کے لیے بھیجا اور ان کے سالانہ گرانٹ میں بھی مستقل اضافہ ہوگیا۔

البتہ سردار نائب السلطنت کی صدارت میں جو باتیں ہوتیں وہ محفوظ رہتیں اور ان سے افغان گورنمنٹ اپنی ترقی کے لیے راستہ سوچتی۔ اس قسم کے کاموں میں سے ایک کام حکومت موقتہ ہند کا قیام تھا۔

روسی ہندستانی مشن راجہ مہندر پرتاب اور مولانا برکت اللہ نے مل کر حکومت موقتہ ہند کی بنیاد ڈالی جس میں بعض جرمن اور ترک بھی شامل ہوئے۔ اس حکومت نے ایک وفد روسی گورنمنٹ کے پاس بھیجنے کا فیصلہ کیا اور سردار نائب السلطنت نے اسے منظور کرلیا۔ اس پروگرام پر کام کرنے کے لیے ان کے پاس کوئی ہندستانی نہیں تھا وہ چاہتے تھے کہ یہ نوجوان ان کے ساتھ کام کریں مگر یہ لوگ ہماری تنظیم میں جکڑے ہوئے تھے۔ اس لیے ہم سے براہ راست باتیں شروع ہوئیں۔ ہماری ابتدائی گفتگو میں ایک افغان افسر بھی موجود رہتا تھا اور ہمارے تبادلہ افکار سے وہ بہت سی باتیں سمجھنے لگ گیا۔ جو پہلے اس کی توجہ جذب نہیں کرسکتی تھیں ہمارے ساتھ ان نوجوانوں کے سوا دو سکھ بھی رہتے تھے۔ جو غدر پارٹی کے ممبر تھے اور ہندستان سے بھاگ کر افغانستان میں بلا پاسپورٹ داخل ہوگئے تھے۔ وہ بھی پہلی پولیس کی حفاظت میں تھے پھر آزاد ہوکر ہمارے ساتھ رہنے لگے تھے۔ راجہ صاحب کی تجویز تھی کہ ان میں سے ڈاکٹر متھرا سنگھ کو اس روسی مشن پر بھیجا جاوے۔ مولانا برکت اللہ مرحوم کی تائید کے بعد دوسرے ممبر اس داخلی مسئلہ سے زیادہ دلچسپی نہیں رکھتے تھے۔ اس لیے وہ موافق ہوگئے۔ اب ہمارے سامنے یہ مسئلہ ایک فیصلہ شدہ صورت میں ظاہر کیا گیا۔ لیکن ہم ڈاکٹر متھرا سنگھ کی عام

سیاسی واقفیت سے آشنا ہو چکے تھے۔ ہم نے اس میں ترمیم پیش کر دی کہ اس مشن پر ڈاکٹر متھرا سنگھ کو ساتھ ایک نوجوان مسلمان بھی جانا چاہیے۔ راجہ صاحب نے اسے پسند نہیں کیا۔ اور اسی پر مباحثہ شروع ہو گیا۔ میرا خیال تھا کہ مسلمانوں کے اشتراک عمل کا یہ مطلب نہیں کہ کام سوچنے والی جماعت میں ایک مغلوب حصہ مسلمانوں کا شامل رہے اور کام کرنے والی طاقت خالص غیر مسلم ہو۔ بلکہ عملی کاموں میں مسلمانوں کی صحیح شرکت ضروری ہی۔

اس مناظرہ نے یہاں تک طول کھینچا کہ سردار نائب السلطنت کے سامنے پیش ہوا۔ ترک وجرمن وافغان بھی اس میں شریک ہوئی طرفین کی باتیں سن کر ہماری رائی کے موافق فیصلہ ہوا ہماری اور راجہ صاحب کی تلخ گفتگو کا یہ آخر حصہ ہی اس کے بعد پھر کبھی کسی قسم کی ضرورت نہیں پیش آئی۔

ساوسی هندستانی مشن کا مسلمان ممبر ہم نے نوجوانوں کے رئیس سے اس کام کے لیے ایک ممبر مانگا۔ اس نے اپنی جماعت کے پورے مشورہ کے بعد ڈاکٹر خوش محمد کو انتخاب کیا۔ یہ نوجوان جالندھر کے رہنے والا ہے۔ میڈیکل کالج لاہور میں دو سال سے زیادہ تعلیم پا چکا ہی مذہبی جذبات جیسے نوجوانوں کے ہوتے ہیں اس میں کسی سے کم نہیں نفس کش، سمجھدار ہے۔ نوجوانوں کی ہجرت کی تحریک کا ایک لیڈر ہے۔ اس کا نام مرزا محمد علی تجویز کیا گیا۔ اور ڈاکٹر متھرا سنگھ کے ساتھ دوسرا ممبر قرار پایا۔ شیخ محمد ابراہیم جب کابل چھوڑنے پر مجبور ہو گئی تو اسی مرزا محمد علی کو میں نے اپنا رفیق قرار دیا۔ میری جس قدر کامیابی افغانستان اور اس عہد کے آزر وس میں مانی جا سکتی ہے اس میں مرزا محمد علی کی ہمت و محنت کا حصہ غالب ہے۔ اس میں

شک نہیں کہ اگر وہ ہمارے ساتھ نہ مل جاتا تو شاید کوئی بڑا کام نہ کر سکتا۔ خدا نے صحیح اشتراک میں بڑی قوت رکھی ہے۔ اجزاء کے انفرادی قوت سے اضعاف مضاعفہ برکات نازل ہوتے ہیں۔ دو دل یک شود بشکند کوہ را۔ اگر صحیح ہو تو دس بیس کارکن شریک ہو جائیں نقلی عقول صحیحہ پر شرکت ہو۔ تقسیم عمل و تقسیم فوائد میں عدل ملحوظ رہے۔ فقط اتنی طاقت دنیا میں انقلاب پیدا کرنے کے لیے کافی ہے۔ ایک عالمگیر برادری جو قرآن پر ایمان کا دعوی کرتے ہے کیا ان میں سے ایک مختصر سمجھدار جماعت پیدا نہیں ہو سکتی۔ یقیناً ہو سکتی ہے۔ مگر انھیں قرآن پر غور کرنے کی فرصت کہاں۔ مخالفین کے پروپگنڈا سے مرعوبیت نے انھیں کسی کام کا نہیں چھوڑا۔

انا للہ وانا الیہ راجعون۔ کابل سے سفر کرنے سے چند روز پہلے مرزا محمد علی روس کے انقلابی اشتراکی جماعت کا ممبر بن گیا۔ اس کے بعد ہمارا ان کا رسمی اشتراک نہیں رہا فقط دوستی اور محبت باقی ہے

مرزا محمد علی کیلیے سفر خرچ

راجہ صاحب نے ڈاکٹر متھرا سنگھ کا سفر خرچ اسے دے دیا۔ ہم سمجھتے تھے کہ راجہ صاحب پوری مشن کا خرچ دیں گے۔ یا شاید حکومت افغانیہ انتظام کر دے گی۔ مگر ایسا نہیں ہوا ہماری ساری زندگی اسی طرح گذری کہ روپیہ پیسہ کا کوئی خاص اہتمام نہیں کیا جب ضرورت پیش آئی کسی نہ کسی طرح سے روپیہ مل گیا۔ اس سے ہماری دل میں اپنی پروردگار پر زیادہ اعتماد پیدا ہوتا۔ اور اسی کو اپنی زندگی کا روشن پہلو شمار کرتے رہے۔ کابل کا سفر اسی قاعدہ پر تھا۔ ہم جب قندھار پہنچے تو ہمارے پاس فقط ایک پونڈ تھا۔ اور ہم چار آدمی تھے۔ نائب الحکومۃ نے ہمیں سفر خرچ دیا۔ مگر اسے معلوم نہیں تھا کہ ہم خالی ہاتھ ہیں۔ جب ہم کابل پہنچے ایک

مہینے میں ہی ہمارا خرچ ختم ہو گیا۔ اور ہم نے جس قدر کپڑے یا سامان راحت خریدا تھا۔
سب بیچ ڈالا۔ اس وقت ہندوستان سے ایک دوست نے کسی قدر روپیہ بھیجا اور لوگوں سے
ملنے کے قابل ہم کپڑے بنا سکے۔ پھر سردار نائب السلطنت نے بطور مہمانی ہمیں شاید پانسو روپے بھیجے، تو ہمارے
بعض ساتھی جو ہندوستان واپس ہوئے ان کی ضروریات میں صرف ہو گیا۔ میں شیخ محمد ابراہیم کے ساتھ
کھانے میں شروع سے شریک ہو گیا۔ مگر اور کسی قسم کی اعانت ہم ان سے نہیں چاہتے تھے۔ وہ
سمجھتا رہا کہ میں کام کے لیے ہند سے بہت سا روپیہ لایا ہوں اور میں اسے مایوس نہیں کرنا چاہتا
تھا۔ اب مرزا محمد علی کا خرچ دینا ضروری تھا۔ میں نے شیخ ابراہیم سے روپیہ مانگا۔ اس مرحوم نے اس
وقت انکار کر دیا۔ اگرچہ بعد میں ان کا تمام روپیہ اور سب سامان اسی کام میں صرف ہوا۔ اپنے
فیصلے سے انھوں نے یہ سب کچھ کیا۔ لیکن اس خاص وقت پر ان سے غلطی ہو گئی۔ ان کے دوسرے
ساتھی مولوی محمد علی قصوری تھے۔ مولانا عبد القادر قصوری سے ہماری سرسری ملاقات ہو چکی تھی۔
مولوی محمد علی کا تعارف مولانا ابو الکلام نے کرایا تھا۔ مگر وہ شیخ محمد ابراہیم کی طرح ہمارے کام میں
شریک نہیں تھے۔ خاص مشوروں میں فقط شیخ محمد ابراہیم پر ہمارا اعتماد تھا۔ عام معاملات
میں مولوی محمد علی بھی شریک رہتے۔ ہمیں امید نہیں تھی کہ وہ ہماری مدد کریں گے۔ ہم نے
اپنی تکلیف کا ہلکی الفاظ میں ان سے ذکر کیا وہ بہت متاثر ہوئے۔ اور انھوں نے بہت جلد
دو ماہ کی اپنی تنخواہ پیشگی وصول کر کے ہماری ضروریات پوری کر دی۔ ہم نے اللہ کا خاص
لطف دیکھا۔ اور مولوی محمد علی کے از حد ممنون رہے جیسے آخر میں شیخ محمد ابراہیم کا تمام

اندوختہ ہمارے کام میں صرف ہوا۔ اسی طرح مولوی محمد علی نے جس قدر کابل سے کمایا۔ وہ سب ہمارے اس ہندستانی سیاسی کاموں میں صرف ہوا۔ ممکن ہے کہ کچھ روپیہ مولوی محمد علی نے گھر سے بھی منگایا ہو جو ہماری ضرورتوں میں صرف ہوا ہو جزاھم اللہ خیرا۔

سیاسی کام فقط نظریات یاد کرنے یا عملی تجربہ کے مالک ہونے سے نہیں چلتے۔ اس میں کامیابی کے لیے ایک مستعد جماعت اور روپیہ کی بھی ویسی ہی ضرورت ہے جیسے علم و عمل کی۔ ہندستانی مسلمان جس قدر اللہ تعالیٰ کا شکر کریں وہ تھوڑا سمجھا جائے گا۔ ان کے نام سے کابل میں بے سروسامانی کی حالت میں کام شروع ہوتا ہے تو ان کے نوجوان بہترین کارکن ثابت ہوتے ہیں۔ اور روپیہ تو مولوی محمد علی اور شیخ محمد ابراہیم کا تھا جو وقت پر کام آیا۔ ہمارا خیال ہے کہ ان لوگوں کا نام قوم کو خاص طور پر یاد رکھنا چاہیے اور ہمیشہ ان کے لیے دعا کرنی چاہئے۔

حکومت موقتہ ہند میں ہماری شمولیت اس مشن روانہ ہونے سے پہلے ہم نے جرمن ممبروں سے زیادہ ملنا شروع کر دیا۔ اس میں ہمارے دوست عبدالباری بی اے، کی رفاقت ہمیں کام آئی۔ راجہ صاحب نہیں چاہتے تھے کہ وہ کسی دوسرے ہندستانی سے ملیں۔ ہماری ملاقاتیں کا مسلسل دیکھ کر راجہ صاحب نے ہمیں حکومت موقتہ میں شامل ہونے کی دعوت دی۔ انھیں خیال تھا کہ ہم شاید اس میں شامل ہونا پسند نہ کریں کیونکہ اس کا جس قدر نظام ان دونوں صاحبوں نے تجویز کیا تھا۔ اس میں راجہ صاحب کے نام پر وفاداری کا حلف بھی ضروری تھا۔ مگر میں نہایت مسرت سے اس میں شامل ہو گیا۔ البتہ حلف نامہ تبدیل کر دیا۔ جسے انھوں نے منظور کر لیا۔ اس کے بعد ہندستانی

معاملات میں ہماری گفتگو بیرونی معاملات سے پاک ہو گئی۔ ابتداء میں حکومت موقتہ کے تین ممبر رہے۔ امیر امان اللہ خاں کے زمانہ میں جنگ افغانستان کے خاتمہ پر اور ممبر بھی بڑھائے گئے اس میں جماعت مجاہدین کے وکیل مولانا محمد بشیر صاحب خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

راجہ صاحب بے شمار خوبیوں کے مالک ہیں لیکن اپنی شخصی ڈکٹیٹر شپ کا خیال ان کے دماغ پر غالب تھا۔ یورپین لوگوں سے وہ ان کی زبان میں باتیں کر لیتے اور ڈیموکریسی کے لکچر دے لیتے۔ لیکن ہندستانی معاملات میں ان کی موروثی خصلت نمایاں رہتی۔ ہم نے داؤ پیچ سے انھیں راضی کیا کہ حکومت موقتہ اپنا چارج اس جماعت کو دیدے گی۔ جسے انڈین نیشنل کانگرس نے اس کام کے لیے معین کیا ہو۔ ورنہ وہ اس کے سوائی کوئی بات ہی نہیں جانتے تھے۔ کہ یہ کام پریذیڈنٹ کے اختیار میں چھوڑ دینا چاہیے۔ اور وہ لائف پریذیڈنٹ اپنی ہی تجویز کردہ قانون سے مقرر ہو چکے ہیں۔ جب راجہ صاحب نے کابل چھوڑا تو حکومت موقتہ کے لیے تین مرکز تجویز ہوئے کابل۔ نیپال۔ شمالی مشرقی بنگال۔ کابل کے مرکز میں کام ہمیں تفویض ہوا۔ اس کے بعد ہم نے "جنود اللہ" اور اپنی باقی نام کار زوائیوں کو حکومت موقتہ کے مرکز کابل سے متعلق کر دیا۔ امیر امان اللہ خاں جب برسر اقتدار آئے تو انھوں نے ہمیں حکومت موقتہ کا نمائندہ مان کر سرکاری معاملات صلح و حرب میں شریک کیا جب جنگ کا فیصلہ ہونے لگا تو اس خاص مجلس میں مجھے بلا کر سرفراز فرمایا۔ دوران جنگ میں بعض اہم امور میرے حوالے کیے گئے جنگ ختم ہونے پر ابھی صلح کرتے ہیں ہمارے خدمات خاص طور پر تسلیم کی گئی۔ اس تمام زمانہ

ہمارے نوجوان رفیقوں کے کارنامے سنہری حرفوں سے لکھے جائیں گے۔ اگرچہ ایک زمانہ تک ان پر پردہ ڈالنا ضروری ہے۔ جنگ ختم ہونے کے بعد راجہ صاحب دوبارہ کابل تشریف لائے۔ تو امیر امان اللہ خان ان کے اعزاز میں ایسے کام کیے جن کی راجہ صاحب کبھی توقع نہیں رکھتے تھے۔ آخر میں امیر صاحب نے ہمارے مشورہ حرفاً حرفاً قبول فرمائی۔ آخری سال جب ہم کابل سے رخصت ہوئے۔ امیر صاحب ہمیں افغانستان میں رہ کر حکومت موقتہ کا کام کرنے سے روک دیا۔ انٹرنیشنل سیاسیات کی پابندی ضروری ہے۔ ہم نے ایک شرط پر اسے منظور کر لیا۔ جب وہ وعدہ پورا کرنے میں تعطل تک آیا۔ تو ہم نے افغانستان سے رخصت ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ میں بذات خود تھوڑے سے تغیر کے بعد آرام و عزت سے کابل میں رہ سکتا تھا۔ مگر میرے نوجوان رفیق جن کی مستقبل ہماری عزت افزائی کا سبب بنتی رہیں۔ ان کا مستقبل برباد ہو جاتا۔ اس لیے میں کابل سے نکلنا ضروری سمجھتا تھا۔ اب ہم اطمینان سے نہیں - مجتمع نہیں - لیکن یہ کوئی نہیں کہتا کہ فلاں نے اپنے فائدے کے لیے دوسروں کو نقصان پہنچایا۔ اور اگر کبھی موقع میسر آیا تو ان شاء اللہ تعالیٰ، تمام دوست پھر ایک ہو جائیں گے۔ واللہ الموفق۔

باب (۴۴) ڈاکٹر متھرا سنگھ اور مرزا محمد علی روسی مشن پر بھیجے گئے ان کے ساتھ زار کے نام ایک عریضہ یا پیام تھا۔ جو سونے کی پتری پر کندہ کرایا گیا تھا۔ ایک خط گورنر تاشقند کے نام تھا۔ دو ممبر کے ساتھ دو خادم کابل سے دیے گئے مرزا محمد علی کا خادم افغان تھا۔ اور ڈاکٹر متھرا سنگھ کا خادم ایک کابلی سکھ تھا۔ مشن ترمذ سے تاشقند پہنچا۔ گورنر نے زار کو مطلع کیا۔

روس اس وقت پریشان تھا۔ اس نے برطانیہ سے بہت سے مطالبات شروع کر دیے۔ اور اس مشن کی کارروائی کو بہانہ بنایا اور برطانیہ مشن کو جعلی قرار دیتا ہے۔ لیکن روس اسے تسلیم نہیں کرتا اور افغانی حملہ سے خوف زدہ ہو جاتا ہے۔ برطانیہ ہندستان سے ان ممبروں کی تشخیص کراتا ہے۔ مگر صحیح طور پر معین نہیں ہو سکتے۔ بالآخر زار نے ممبروں کی گرفتار کرنے کا حکم دے دیا مگر گورنر تاشقند کی مداخلت سے یہ لوگ قید سے بچ گئے۔ یہ مشن بیکار نہیں ثابت ہوا روسی انگریزی اتحاد میں کسی قدر مشکلات پیدا کر سکا۔ جس کی تلافی کے لیے لارڈ کچنر کو خود سفر کرنا پڑا۔ روسی انقلابیوں نے ایک پمفلٹ شائع کیا ہے جس کا نام ہے "سونے کی پٹاری" اس میں اس مشن کے متعلق خط و کتابت مذکور ہے۔ جب یہ مشن واپس آیا تو ڈاکٹر متھرا سنگھ تنہا سردار نائب السلطنت کے پیش ہوا سردار کے تمام سوالوں کے جواب میں ڈاکٹر یہی کہتا رہا کہ بخیر رفتیم و بخیر آمدیم۔ اس کے بعد سردار نائب السلطنت نے مرزا محمد علی کو بلایا اور سفر کی کیفیت پوچھی۔ محمد علی نے تمام واقعات کی مختصر یادداشتیں لکھ کر رکھی تھیں۔ جیب سے اپنی کتاب نکالی اور مفصل حالات گفت و شنید کا خلاصہ سب سے ذکر کر دیا۔ اس کے بعد سردار نائب السلطنت ہماری بہت زیادہ قدر کرنے لگے۔ انھوں نے اپنے خاص لوگوں سے کہا کہ اگر ہم مولانا عبید اللہ کی بات نہ مانتے تو راجہ صاحب کا فرستادہ ہمیں ایک حرف بھی نہ بتلاتا۔

ہندستانی حکومت کا ایک اخلاقی حملہ

ہماری تربیت اسلامی تعلیمات میں علماء دیوبند کے مسلک پر ہوئی۔ دیوبندی جماعت حنفی فقہ کی

پابند ہیں لیکن بہت سے غلط رسوم کی تردید میں مولانا محمد اسمٰعیل شہید کے طریقہ پر ہے۔ اس میں یہاں تک مبالغہ کیا جاتا ہے کہ مولانا اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کے اصلی اتباع یہ لوگ اپنے سوا کسی کو نہیں مانتے۔ سندھ میں میں نے بیس سال زندگی بسر کی ہے۔ میرے بزرگ سب اسی دیوبندی مسلک سے ملتے جلتے ہیں اگرچہ علمائے دیوبند سے ان کے افادہ و استفادہ کا کوئی رابطہ نہیں۔ ان کے مخالف سندھ میں پیروں اور مولویوں کی تعداد کافی ہے۔ ہندستانی حکومت نے ان میں سے ایسے لوگوں کا انتخاب کیا جن کا قندھار کے پیروں سے قوی تعلق تھا۔ ان کے قندھاری بزرگوں میں سے ایک پیر کابل تشریف لائے۔ اور سردار نائب السلطنت سے ملے۔ اور انھیں یقین دلایا کہ مولانا عبید اللہ حکومت ہند کا فرستادہ ہے اور اس کا مقصد ہے کہ افغانستان کے لوگوں کا مذہب خراب کرے۔ اور حکومت افغانستان کے اسرار سے انگریزوں کو مطلع کرے۔ سردار نائب السلطنت کے سیکرٹری نے ہم سے ذکر کیا ہم نے اس کا توڑ اسے سمجھا دیا کہ ہمارے متعلق وہ افغان سی۔ آئی۔ ڈی کے افسر کو مقرر کرے کہ حکومت ہند کی رائے معلوم کرے۔ اس پر جس قدر خرچ آئے۔ اس سے گریز نہ کریں۔ اگر ذرا سا شبہ ثابت ہو تو مجھے توپ سے اڑا دیا جائے دوسری صورت میں جہاں سے میں آج کام چھوڑ رہا ہوں۔ وہیں سے شروع کر دوں گا۔ گویا یہ زمانہ بیماری کے رخصت میں محسوب ہوگا۔ غالباً یہ تجویز سردار کو پسند آئی۔ اور اس پر عمل کیا گیا۔ ہمیں معلوم ہوا کہ افغان خفیہ نویسوں نے لکھا کہ اس شخص کے نامہ اعمال میں ایک نقطہ بھی سفید نہیں رہا۔ اس کے بعد سردار نائب السلطنت نے ہمیں خاص طور پر باریاب فرمایا اور ہم اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔

استانبولی مشن اور روسی جاپانی مشن

پہلی مشن کی کامیابی پر راجہ صاحب نے دو مشن اور بھیجنے کا فیصلہ کیا ایک ہماری منشاء کے مطابق استانبول بھیجا گیا۔ اس میں ہمارے رفیق عبدالباری بی اے، اور ڈاکٹر شجاع اللہ مقرر ہوئے۔ یہ ایران کے راستہ استانبول پہنچے گا۔ دوسرا مشن مولانا برکت اللہ کی تجویز پر مقرر ہوا۔ اس میں شیخ عبدالقادر بی اے اور ڈاکٹر متھرا سنگھ روس کے راستہ سے چین و جاپان جائیں گے۔

کیپٹن فون ہنٹگ سب سے پہلے کابل سے واپس گئے امیر صاحب نے انہیں جواب دے دیا۔ وہ جاتے وقت میرے نام تین سو پونڈ چھوڑ گئے۔ راجہ صاحب نے مجھے حکم دیا کہ وصول کر لوں۔ اس میں سے ایک سو پونڈ راجہ صاحب اور مولانا برکت اللہ صاحب نے اپنے کپڑے طیار کرانے کے لیے لے لیے اور دو سو پونڈ شیخ محمد ابراہیم مرحوم کے پاس امانت رکھا گیا۔ شیخ ابراہیم اور مولوی محمد علی اور میرا بھتیجہ عزیز احمد جس گھر میں رہتے تھے اس پر رات کو ڈاکہ پڑا اور وہ تمام روپیہ اور دونوں صاحبوں کے کپڑے اور سامان ڈاکو لے گئے۔ مجھے خطرہ محسوس ہوا کہ راجہ صاحب اس ڈاکہ کو ہمارے روپیہ ہضم کرنے کا بہانہ تصور کریں گے۔ جب استانبولی مشن جانے کا وقت آیا تو اس کے لیے سو پونڈ مولانا محمد بشیر وکیل رئیس المجاہدین سے قرض لے کر ادا کر دیا۔ مولانا محمد بشیر کا یہ احسان میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ قرض کا تو فقط نام تھا۔ اگرچہ بعد میں مرزا محمد علی نے یہ روپیہ ادا کر دیا۔ دوسری مشن کی روانگی سے پہلے سرکاری طور پر ڈاکہ کی تصدیق ہو چکی تھی اور چوروں کے پاس روپیہ کا ثبوت ہو چکا تھا۔ اگرچہ ہمیں اس میں سے کچھ بھی نہیں ملا۔ اب راجہ صاحب

[illegible] میں مولانا برکت اللہ کے ساتھ سردار نائب السلطنت کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس واقعہ میں روپیہ ضائع ہونے کا ذکر کیا اور ایک سو پونڈ کی ضرورت ظاہر کی۔ سردار صاحب نے بکمال مہربانی وعدہ فرمایا اور شام کو خود سو پونڈ کو ساتھ لائے۔ اسی طرح یہ دوسرا مشن بھی روانہ ہو گیا۔

ان ممبروں کی گرفتاری | روس نے دوسری مشن کو جب ان کی سرحد عبور کر چکا تو گرفتار کر لیا اور انگریزوں کے حوالہ کر دیا۔ استنبولی مشن کو ایران میں انگریزوں نے خود گرفتار کر لیا۔ چاروں ممبر لاہور پہنچے۔ ڈاکٹر متھرا سنگھ چونکہ پہلے ایک اور کیس میں مفرور تھا۔ اسے پھانسی پر لٹکا یا گیا۔ اور ممبر باقی تین ممبر نظر بند رہے۔ ان میں سے عبدالباری جو ہر ایک موقعہ پر ہمارے ساتھ رہا اور نوجوانوں کی جماعت کا رئیس تھا۔ سر محمد شفیع کا رشتہ دار نکلا۔ سر محمد شفیع اسے معافی مانگنے پر راضی کر لیا۔ اس نے تمام واقعات حکومت موقتہ کے اور جنود اللہ کے اور جماعت مجاہدین کے مفصل لکھ دیے۔ اور باقی دونوں ممبروں نے اس پر دستخط کر دیے۔ کچھ عرصہ نظر بند رکھ کر انہیں چھوڑ دیا گیا۔ حکومت ہند روسی مشن کے زمانہ میں سے واقعات کی تحقیق کے لیے پریشان تھی۔ اب اسے باطمینان مفصل اطلاع مل گئی۔

نتیجہ | حکومت ہند کے پروٹسٹ کا پہلا نتیجہ یہ نکلا کہ شیخ محمد ابراہیم رحمۃ اللہ علیہ اور مولوی محمد علی حبیبیہ اسکول سے معزول کر دیے گئے۔ اور میرا بھتیجا عزیز احمد جو حبیبیہ اسکول کا طالب العلم تھا خارج کر دیا گیا۔ آج عزیز احمد ہماری جماعت قونصل اور نائب وزیر اور جنرل بن گئے۔ اور یہ باوجودیکہ علمی اور عملی لیاقت میں ان سے کسی طرح کم نہیں۔ اسی طرح جوتیاں چٹخاتا پھرتا ہے۔

اسی طرح ہم اپنی حکومت ضائع کرکے اپنی نسلیں برباد کر رہے ہیں۔ شیخ محمد ابراہیم رحمۃ اللہ علیہ اور مولوی محمد علی نے فیصلہ کیا کہ وہ یاغستان میں رہیں گے۔ پہلے دونوں ہندستانی مجاہدین میں رہے۔ پھر شیخ محمد ابراہیم مرحوم حاجی ترنگزئی کے پاس چلے گئے۔ اور پشتو سیکھ کر لوگوں کو قرآن شریف کی تعلیم دیتے رہے۔ کچھ عرصہ بعد افغانستان سے گزر کر روس پہنچنے کی کوشش کی۔ راستہ میں افغانستان کے ایک گاؤں میں فوت ہوگئے۔ شبہ کیا جاتا ہے کہ ایک ڈاکو یاغستان سے ان کے ساتھ تھا اس نے شیخ محمد ابراہیم کو شہید کر دیا۔ شیخ محمد ابراہیم نے آخری وقت میں دوسرے ساتھی کو ایک کاغذ لکھ دیا ہے میں نے وہ پڑھا ہے ایک لفظ سے شبہ ہوتا ہے کہ شیخ محمد ابراہیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی سمجھنا چاہتے ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ وہ ڈاکو نہ ہو بلکہ ایک انگریزوں کا کارندہ ہو۔ شیخ محمد ابراہیم نے یہ سفر انقلاب روس کے بعد شروع کیا ہے۔ مولوی محمد علی کچھ عرصہ تک مجاہدین میں رہے اور پھر کسی طرح سے سر عبدالقیوم کی معرفت معافی لے کر گھر پہنچ گئے۔ ان کے بیانات سے بھی ہندستانی گورنمنٹ کی علم میں بہت کچھ اضافہ ہوا۔

ہندستانی مشن جب یہ دونوں حضرات یاغستان جا رہے تھے ان کے ساتھ ایک ہندستانی مشن بھی بھیجا گیا اور ہم جب کابل پہنچے۔ تو اپنے دو ساتھی واپس بھیجے تھے ان کے پاس بعض کاغذات اور پیغام تھے۔ انھوں نے احتیاط اور آہستگی سے کام کیا اب راجہ مہندر پرتاب چاہتے تھے کہ ان کی اطلاع ان کے بھائیوں کو ملے اور وہاں سے خیریت کی خبر آئی۔ اس کے لیے ہم نے اپنے بھتیجے محمد علی کو مامور کیا۔ وہ شیخ ابراہیم کے ساتھ یاغستان گیا وہاں سے منزل مقصود پر پہنچ کر خط

پہنچا دیا۔ جواب سے کر دو مہینے میں بخیریت کابل پہنچ گیا۔ مگر راجہ صاحب اس سے پہلے کابل چھوڑ چکے تھے ان کا خط انھیں مزار شریف میں پہنچا دیا گیا۔ اور راجہ صاحب بہت مسرور اور ممنون ہوئے۔ اس کے بعد راجہ صاحب ہم سے بھائیوں کا سا معاملہ کرتے رہے۔ اپنی پرائیوٹ امور میں بھی ہم سے مشورہ لیتے اور بعض اوقات ہماری خاطر اپنی رائے چھوڑ دیتے۔ اس مشن کا ایک حصہ وہ کاغذات تھے جو میں نے اور مولانا منصور نے حضرت مولانا شیخ الہند کی خدمت میں بطور رپورٹ لکھی تھی۔ ہم نے انھیں نوجوانوں میں ایک نومسلم شیخ عبدالحق پر اعتماد کیا۔ اسی کپڑے پر لکھ کر مکتوبات دیے کہ وہ شیخ عبدالرحیم ابادی کو پہنچا دے اور شیخ صاحب حج پر جائیں اور حضرت مولانا کی خدمت میں پیش کریں۔ اس اللہ کے بندے وہ خطوط اللہ نواز خاں کے والد خان بہادر حق نواز خاں کو دے دیئے۔ خاں صاحب نے سر مائیکل اڈوائر کو پہنچا دی اس کے بعد واقعات مشہور رہیں۔ ہندستان میں گرفتاریاں شروع ہوئیں۔ ہم حیران رہ گئے۔ چند روز بعد مولانا شیخ الہند اور ان کے رفقاء مکہ معظمہ سے گرفتار ہوئے۔ ایک عرصہ بعد ہمیں حقیقت معلوم ہوئی۔ یہ واقعات ہمارے لیے موت سے زیادہ ناگوار تھے۔ مگر ایک بات کی مسرت بھول نہیں سکتے تھے۔ اگر خدانخواستہ راجہ صاحب کا خط ہم عبدالحق کو دے دیتے اور ایسا معاملہ پیش آتا تو ہمارے لیے ناقابل برداشت مصیبت ہوتی۔ اب ہم خوش ہوتے ہیں کہ راجہ صاحب کا کام تو ہو گیا۔ ہمارے لوگ قید و مصیبت میں ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے لیے آسانی کر دے گا۔

ہماری نظربندی اور قید اس کے بعد ہندستانی حکومت کے اعتراض کا یہ اثر ہوا کہ مولانا منصور کو

اور مولانا سیف الرحمٰن کابل سے یاغستان روانہ کر دیئے گئے۔ جلال آباد تک دونوں ساتھ رہے۔ مولانا سیف الرحمٰن کو جلال آباد میں پرورشش افغانوں نے اپنی بیعت میں لے لیا اور ہندستانی معاملات سے علیٰحدگی کا وعدہ کرا لیا۔ اب وہ مستوفی الممالک کے مہمان ہو کر رہنے لگے۔ امیر حبیب اللہ خاں کی آخری حکومت تک وہ مستوفی کے ساتھ رہے اور مستوفی کو جو کام انگریزوں کی تائید کے لیے دیا جاتا اس میں اس کی مدد کرتے۔

انور پاشا کا خط ہندستانی حکومت کو اطلاع ملی کہ حضرت مولانا شیخ الہند نے انور پاشا سے خط لے کر ہندستان بھیجا ہے۔ اور وہ اکابر دیوبند کے پاس کہیں محفوظ ہے۔ اس کے لیے ہندستان میں جس قدر کوشش ہوئی اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔ اب جب امیر حبیب اللہ خاں کی حکومت سے امداد لی گئی تو مستوفی الممالک نے ایک دیوبند کے پرانے طالب العلم کو جو حضرت شیخ الہند سے خصوصیت رکھتا تھا۔ افغانستان میں سے ڈھونڈ نکالا۔ اسے دیوبند بھیجا گیا۔ کہ اعلیٰ حضرت امیر صاحب وہ کاغذ مانگتے ہیں۔ اس میں مولانا سیف الرحمٰن کی واقفیت مستوفی کی امداد نہ کرتی تو یہ تجویز بر روی کار آ ہی نہ سکتی۔ اس دیوبندی بزرگ کا پتہ بھی مولانا سیف الرحمٰن ہی نے دریافت کر لیا تھا۔ کہتے ہیں کہ اس بزرگ کو کچھ شکوک پیدا ہو گئے۔ اس لیے خط ہاتھ نہیں آیا۔ اس کے بعد بعض احتیاط پسند بزرگوں نے وہ خط جلا دیا۔ مولانا منصور انصاری افغانستان سے یاغستان چلے گئے۔ اور ایک زمانہ تک وہیں رہے۔ اس کے بعد ہمیں یکم رمضان ۱۳۳۵ھ کو ایک تنگ مکان میں لاکر قید کر دیا گیا۔ ہم لوگ بیس پچیس آدمی تھے۔ اور وہ گھر کسی حالت میں

وہاں سے زیادہ آدمیوں کے لیے موزوں نہیں تھا۔ ہماری نگرانی سردار سپہ سالار سے تعلق رکھتی تھی۔ انہیں ہم نے توجہ دلائی انہوں نے ہمارے لیے ایک سرکاری باغ میں خیمے لگوا دیئے۔ اور عید رمضان پر خود ہمارے خیموں میں تشریف لائے۔
ایک عرصہ کے بعد ہماری نگرانی مستوفی الممالک کے سپرد ہوئی۔ اب ہم نے مولانا سیف الرحمٰن کی امداد سے مستوفی کے گھر پر رہنا شروع کیا ہمارے ساتھی اسی طرح کوتوالی کی حفاظت میں رہے۔ ہمارا ایک رفیق اس مجلس سے بھاگ گیا۔ اور انقلاب روس کے بعد بخارا پہنچ گیا۔ اس کا نام رحمت علی زکریا ہے۔ اس نے اپنی تجویز ہمیں بتلا دی تھی۔ ہم اس کو منع نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اور ہمیں خوف تھا کہ اس کے بھاگنے کا تمام الزام ہم پر عاید کیا جائے گا۔ اس لیے ہم نے مولانا سیف الرحمٰن کے توسط سے ان لوگوں سے علحدگی حاصل کر لی۔ مستوفی الممالک ہمیں جلال آباد میں لے گئے۔ ہم وہیں تھے جب امیر حبیب اللہ خاں قتل کر دیا گیا اور کابل میں امیر امان اللہ خان بادشاہ مستقل ہو گیا۔

باب (۵) امیر حبیب اللہ خاں جب بادشاہ ہوئے تھے تو سردار نایب السلطنۃ ولی عہد قرار پائے تھے دونوں بھائیوں کے اتفاق سے سلطنت کا کام چلتا رہا۔ جب امیر حبیب اللہ خاں کے بیٹے جوان ہو گئے۔ تو اس کی طبع خواہش تھی کہ سردار عنایت اللہ خاں معین السلطنۃ ولی عہد بنایا جاوے اس لیے امیر نے

نہایت دانائی سے کام کیا۔ حرب عمومی کے بعد جب ہندستانی مسلمانوں اور ترکوں کی طرف سے اولاً اور تمام ہندستانیوں اور ترکوں اور جرمنوں کی طرف سے ثانیاً امیر حبیب اللہ خاں پر زور دیا گیا۔ کہ وہ انگریزوں کا ساتھ چھوڑ دیں۔ تو امیر نے تمام اینٹی برٹش معاملات سردار نائب السلطنۃ کے حوالہ کر دیے اور آپ پردہ پر سے معاملات کو نبٹاتا رہا۔ انگریزوں نے کافی روپیہ امیر کو دیا کہ وہ یاغستان میں تقسیم کرے۔ اور اپنی سلطنت کے نام پر تمام قبائل افغانیہ سے بیعت حاصل کرے اور پشاور میں افغانوں کو بھی یہی کہا جاتا کہ جب امیر کابل جہاد کرے اس وقت تم بے شک جہاد میں شریک ہو جاؤ۔ لیکن بغیر بادشاہ کے جہاد جائز نہیں اس لیے تمام بدنظمی سے پرہیز کرو۔ اسی طرح حاجی ترنگ زئی اور دوسرے مجاہدین کا کام رک گیا بلکہ حاجی ترنگزئی کے آدمی اور ہندستانی مجاہدین کے کارندے سب اس کام پر مامور ہو گئے کہ وہ امیر کابل کے نام پر بیعت نامہ حاصل کریں۔ یہ انگریزی روپیہ انھیں لوگوں کے ہاتھ سے یاغستان میں تقسیم ہوا اس کام کے سرانجام دینے والا سردار نائب السلطنۃ تھے۔ تمام بیعت نامہ ان کے دفتر میں محفوظ رہتے تھے۔ امیر صاحب نے اس ترکی جرمن ہندی وفد کو یہ جواب دیا کہ جب تک امدادی فوجیں افغانستان نہ پہنچ جائیں اس وقت تک روس اور انگریزوں دونوں کے خلاف اعلان جنگ خلاف مصلحت ہے۔ البتہ جس وقت ترکی جرمن فوجوں کا پیش خیمہ افغانستان پہنچ گیا۔ اسی دن اعلان حرب کر دیا جائے گا۔ دوسرے

طرف روسیوں اور انگریزوں نے مل کر ایران کے تمام راستے روک رکھے تھے۔ اور انگریزی قوموں کا عراق پر حملہ محض اس پیش قدمی کو روکنے کے لیے تھا۔ اس دوران میں یہ بھی کہا جاتا تھا۔ اگر روس کا خطرہ دفع ہو جائے تو سرحدی قومیں ہند پر حملہ کر سکتی ہیں۔ اس خطرہ کو دفع کرنے کے لیے ہندی روسی وفد تجویز ہوا جس کا ہم ذکر کر چکے ہیں۔ جب روس کی قوت کمزور ہو گئی اور اس مشن کے معلومات سے یہ واضح ہو گیا تھا کہ روس افغانستان پر حملہ نہیں کر سکتا۔ تو نائب السلطنۃ کو جو لوگ ملتے تھے، انھوں نے اپنی وعدہ پورا کرنے کا تقاضا کیا۔ سردار نائب السلطنۃ نے اعلیٰ حضرت سے اس کا ذکر کیا امیر صاحب نے جب جرگہ بلایا جس میں تمام اعلیٰ افسر اور قومی بزرگ شریک تھے۔ امیر صاحب نے اس مسئلہ پر رائے طلب کی تو سوائے سردار معین السلطنۃ کے سب نے متفقاً یہی قرار دیا کہ لڑنا ضروری ہے۔ اہل شوریٰ کو اس نقطہ پر جمع کر لینا یہ سردار نائب السلطنۃ کی قوت عملی کا مظاہرہ تھا۔ امیر صاحب حیران ہوئے اور اپنے شاہانہ فیصلے سے اس مشورہ کو رد کر دیا۔ ایک معین السلطنۃ کیوں امیر صاحب کا ہم خیال ہوا۔ اس کی حقیقت یوں ظاہر ہوئی کہ انگریزوں نے اس کو اس شرط پر ولی عہد قبول کرایا ہے۔ یہ عجیب بات دنیا سنے گی کہ حضرت صاحب چہار باغ جو معین السلطنۃ کے مرشد تھے انھیں انگریزوں نے مکہ معظمہ سے اس خدمت انجام دینے کے لیے کابل بھجوایا اور وہ معین السلطنۃ کو اپنی قومی اور مذہبی فیصلہ سے علٰحدہ رکھنے میں کامیاب ہو گئے۔

کی خرابیاں ظاہر ہوئیں ۔ ان سب کا ذمہ دار براہ راست سردار نائب السلطنہ تھا ۔
اس طرح جس کا تجربہ یہ لوگ کر چکے ہیں اسے دوبارہ بادشاہ نہیں دیکھ سکتے تھے ۔
معین السلطنہ ایک سادہ مزاج شاہزادہ تھا ۔ ایسے سیاسی انقلاب میں اس پر راز
داری کا اعتماد نہیں ہو سکتا ۔ اور اس وقت تو وہ علانیہ اپنے باپ کا طرفدار تھا ۔
سردار امان اللہ خاں کی شرکت سے انقلاب کی تکمیل میں بہت آسانی ہو گئی ۔ علیا حضرة مادر
امیر صاحب کی خانگی زندگی پر حاوی تھیں امیر صاحب کو ان کے واسطہ سے آزار پہنچایا گیا
کہ اگر وہ اپنی بد اخلاقی سے باز آگئے تو ان کی خیر نہیں مگر اس کا اس کے مزاج میں
الٹا اثر ہوا ۔ اس طرح ایک ڈراما سوچا گیا کہ امیر قتل کر دیا جائے ۔ تو وہیں نائب السلطنہ
کو امیر مان لیں تاکہ معین السلطنہ کا حق زائل ہو جائے ۔ اور پھر نائب السلطنہ کے مقابلہ
میں امیر امان اللہ خاں آ جائیں اور ان کو ختم کر دیا جائے ۔ کئی موقعوں پر ذرا سی
فروگذاشت سے تمام کام بگڑتا بگڑتا رہ گیا ۔ لیکن خدا کو منظور تھا اس لیے یہ سارا معاملہ
بخیر و خوبی سے اسی طرح سرانجام پذیر ہوا جس طرح سوچا گیا تھا ۔ اعلیٰ حضرت امیر امان
اللہ خاں نے پہلے دن سے استقلال کا دعویٰ کیا اور ہم قید و بند سے آزاد ہو گئے الحمد للہ علی ذلک ۔
امیر امان اللہ خان سے ہمارا تعارف ۔ ہم نے بعض اشد ضرورتوں کے لیے ڈاکٹر
منیر عزت بیگ سے ایک ہزار روپیہ ایک سال کے وعدہ پر قرض لیا تھا ۔ جب یہ مدت پوری
ہونے کو ہوئی تو ہم متوفی کے پاس نظر بند تھے ۔ روپیہ کہیں قرض لے کر ادا نہیں کر سکتے اور

ان سب

کی خرابیاں ظاہر ہوئیں۔

اس [illegible] جن کا تجربہ یہ لوگ کر چکے تھے [illegible]

معین السلطنت ایک سادہ مزاج شاہزادہ تھا

داری کا اظہار نہیں ہو سکتا۔ اور اس وقت

سردار امان اللہ خان کی شرکت سے انقلاب [illegible] علیاحضرت [illegible]

امیر صاحب کی خانگی زندگی پر عادی تھیں امیر صاحب کو ان [illegible] سے آزار پہنچایا گیا

کہ اگر وہ اپنی بداخلاقی سے باز آ گئے تو ان کی خبر نہیں مگر اس کا اس کے مزاج میں

اتنا اثر ہوا۔ اس طرح ایک ڈرامہ سوچا گیا کہ امیر قتل کر دیا جائے۔ تو وہ نائب السلطنت

کو امیر مان لیں گے اور معین السلطنت کا حق زائل ہو جائے۔ اور جب نائب السلطنت کے مقابلہ

میں [illegible] امان اللہ خان آ جائیں اور ان کو ختم کر دیا جائے۔ [illegible] کی کوششوں پر اراکین

[illegible] سے تمام کام بگڑتا بگڑتا رہ گیا۔ لیکن قدرت کو منظور تھا [illegible]

[illegible] سے اسی طرح سرانجام پذیر ہوا جس طرح سوچا گیا تھا۔ اعلیٰ حضرت [illegible]

[illegible] خان [illegible] نے استقلال کا دعویٰ کیا اور ہم قید و بند سے آزاد ہو گئے [illegible]

[illegible] امان اللہ خان سے ہمارا تعارف ہم نے بعض [illegible]

[illegible] ہزار روپیہ ایک سال کے وعدہ پر قرض مانگا۔ جب [illegible]

[illegible] قرض [illegible]

اس عدم ادائیگی کا اثر ہمارے مستقبل پر بہت برا ہوگا۔ اسے ہم خوب سمجھتے تھے
ہم نے مجبوراً سردار عین الدولہ کی خدمت میں اپنی ضرورت مفصل لکھ کر عرض کیا کہ
ہمیں بارہ سو روپیہ ایک سال کے لیے ضرور قرض دلوایا جائے۔ یہ دو سو زاید ہم نے
آغا سید علی عباس بخاری کی ضرورت پورا کرنے کے لیے لکھے تھے۔ ایک عرصہ سے وہ بھی پشاور
سے ہجرت کر آئے اور امیر صاحب نے انھیں ہم سے علیحدہ نظر بند کر دیا۔ جس وقت سید الاحرار
مولانا محمد علی مغفور ہمیں رخصت کرنے کے لیے دلی میں ملے۔ آغا صاحب مرحوم اس وقت
ان کے ساتھ تھے۔ الغرض سردار عین الدولہ نے روپیہ شام کو مخفی ہمارے پاس متوفی
کے گھر بھیج دیا اس سے پہلے ایک دفعہ سردار نے ہمیں اپنے پاس بلایا تھا اور مستقبل
کے متعلق اشارہ وکنایہ سے باتیں ہوتی رہیں۔ یہ ملاقات بھی ہمارے خاص کاموں کی
تھی۔ خدا کے فضل سے اس میں بھی ہم کامیاب رہے تھے۔ ہمارے متعلق مفصل
معلومات سردار عین الدولہ کو دونوں سرداروں محمود طرزی اور سپہ سالار سے ملتے
رہتے تھے۔ شروع میں جب ہم شیخ محمد ابراہیم رحمۃ اللہ علیہ سے ملے تو اس نے ہمیں دولت
افغانیہ کے تمام اراکین کے متعلق مفصل اطلاعات دیں۔ جب سردار نائب السلطنہ
اور سردار معین السلطنہ کے معاملات بتلا چکے تو آخر میں کہتے ہیں کہ کابل میں پس پردہ
ایک اور قوت ہے جو نہایت سنجیدگی سے باقاعدہ بڑھ رہی ہے اور وہ سردار عین الدولہ ہے
اس کے بعد اول ہماری ان سے ملاقات نہیں ہو سکی مگر جب کبھی ہم ان سے ملے اسی طرح ملے

جیسے بادشاہ ہونے والے سمجھدار شہزادہ سے ملنا چاہئے۔ جب امیر حبیب اللہ خاں جلال آباد میں قتل ہوئے اس وقت ہم مستوفی کے گھر پر زیر نگرانی مولانا سیف الرحمن رہتے تھے۔ مولانا سیف الرحمن صاحب کے کاموں سے تجاہل بن کر ان سے معاملہ کرتے رہے اس میں ہمیں بعض اوقات سخت تکلیفیں پہنچیں۔ مولانا نہیں چاہتے تھے کہ ہمیں واقعات کے متعلق صحیح معلومات حاصل ہوں مگر خدا کی قدرت اڑتی چڑیا ہمارے کان میں بہت کچھ کہ جاتی بعض حصے ہم فوراً سمجھ لیتے۔ بعض اوقات واقعہ گزرنے کے بعد حقیقت منکشف ہو جاتی انتشارش جب جلال آباد پہنچا تو ایک ہفتہ تک ہم بریشان اوارہ دیہات میں پھرتے رہے۔ جب اعلیٰ حضرت امیر امان اللہ خاں کابل میں مستقل ہو گئے۔ تو انھوں نے ہمیں جلال آباد سے کابل طلب فرمایا۔ جب ہم دربار میں حاضر ہوئے تو مسکراکر کرمن مہمان ہستم۔ اس خاص ملاقات کی طرف اس سے۔ اشارہ فرمایا

باب (۶)

اعلیٰ حضرت امیر امان اللہ خاں کی سلطنت میں چند روز ہم نے اپنی حکومت کی ذرا سی جھلک دیکھ لی۔ جس قدر وہ اپنی وزراء کی پہلی صف پر اعتماد کرتے تھے ہمارے ساتھ ان کا معاملہ اسی کی قریب قریب تھا۔ ہم ان کی پرائیوٹ مجلسوں میں حاضر ہوتے تو جیسے وہ اپنے خاندانی اور قومی بزرگوں کا احترام کرتے تھے۔ ہم سے ان کا برتاؤ اسی طرح کا ہوتا۔ ہم نے کوئی مشورہ حرف نہیں کیا جو قبول نہ فرمایا ہو۔ ہم نے کوئی سفارش نہیں کی جو رد کر دی گئی ہو۔

ایسی حالت میں جو کچھ ہم سے ہو سکتا تھا۔ ہم نے افغانستان کی سلطنت مستقل و مستحکم بنانے میں امدادی خدمت سے دریغ نہیں کیا۔ پھر تمام سیاسی معاملات ابھی تک تاریخ کے درجہ تک نہیں پہنچے۔ اس لیے ہم تفصیلات نہیں لکھ سکتے۔ حضرت مولانا شیخ الہند کی وفات پر جس شان سے نیابے نظیر مجلس فاتحہ خوانی اعلیٰ حضرت نے منعقد فرمائی۔ وہ ابھی یادگار ہے۔ اس تقریر کا ایک فقرہ نقل کرتا ہوں "مولانا محمود حسن یک کار را شروع کردند من او را پورا می کنم" راجہ مہندر پرتاب جب یورپ سے واپس آئے اور اعلیٰ حضرت سے خاص ملاقاتیں کر چکے۔ تو اعلیٰ حضرت کو۔ آئیڈیل کنگ، لکھا کرتے تھے۔

ہم نے آخر میں اعلیٰ حضرت سے ہندستانی تعلیم گاہ کھولنے کی اجازت مانگی تھی۔ برٹش سفیر نے افغانی وزیر خارجہ کو راضی کر لیا کہ ہمیں ہندستانی یونیورسٹی کابل کے لیے موقعہ نہیں دیا جائے گا۔ لیکن اس کی قیمت اسے کافی مقدار میں ادا کرنی پڑی۔ اگر ہمارے رفقاء نوجوانوں کا مستقبل ہمارے سامنے نہ ہوتا اور حکومت موقتہ کے بعض کارروائیوں میں ہماری شرکت ضرور نہ ہوتی۔ تو ہم اعلیٰ حضرت کی سلطنت سے باہر جانے پر شاید راضی نہ ہوتے۔ جب سے کابل میں ہم نے شیخ محمد ابراہیم مرحوم کی جگہ پر مرزا محمد علی عرف احمد حسن کو اپنا شریک بنایا۔ اسی وقت احمد حسن کا مددگار ظفر حسن تجویز کر لیا تھا۔ جب احمد حسن یا محمد علی اشتراکی جماعت میں شامل ہو گیا۔ تو ہمارا معتمد اس زمانہ سے ظفر حسن رہا۔ افغانی۔ انگریزی محاربہ میں ظفر حسن سردار سپہ سالار کے ساتھ تھل کے محاذ پر تھا۔ وہاں

اس کی خدمات بہت زیادہ تحسین کے قابل سمجھے گئے۔ اور سلطنت افغانیہ برائے نام خدمت پر اسے معزز تنخواہ دیتی رہی۔ جس سے ہمارے کئی ہندوستانی بھائی آسانی سے ظفر حسن بھی مددگار۔ اللہ نواز خاں مقرر ہوئے جو گورنمنٹ کالج لاہور میں ظفر حسن کے ہم جماعت تھے۔ افغانی انگریزی محاربہ میں وہ ہندوستان بھی ہو آئے تھے۔ کابل سے رخصت ہونے پر ہم نے اپنے تمام دستاویز ان کی خویل میں رکھ دیئے تھے۔ کہتے ہیں۔ سقاؤ کے فتنے وہ تمام کاغذات کھوئے گئے۔ ہمیں بعض قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کاغذات برٹش حکومت کے ہاتھ آ گئے ہیں۔ اللہ نواز نے سقاؤ کے مقابلہ میں خوب کام کیا۔ اس لیے افغانستان کی موجودہ حکومت میں وہ ایک معزز رکن مانے جاتے ہیں۔
مہاجرین کی کثیر تعداد میں ہمارے بعض عزیز بھی ہم سے ملے مولوی احمد علی کو تو ہم نے ہندوستان واپس بھیجنا ہی مناسب خیال کیا۔ کافی محنت سے ہم اسے اس پر راضی کر سکے۔ ڈاکٹر شیخ نور محمد سندھی حیدر آباد سندھ سے پہنچ گئے تھے وہ ہمارے ساتھ رہے حکومت موقتہ کا کام جب اعلیٰ حضرت نے روک دیا تو ہم نے کابل کانگریس کمیٹی بنائی جس کا روح رواں ڈاکٹر نور محمد تھا۔ اس کا الحاق بھی کانگریس سے منظور ہو گیا۔ ڈاکٹر نور محمد ہمارے کانگریس کمیٹی کا سیکرٹری تھا۔ مہاتما گاندھی اور کانگریس کے نوجوان ممبر سب اسے خوب

جانتے تھے۔ ہمارے مکرم ڈاکٹر انصاری کانگریس کے سیکرٹری تھے۔ اس لیے یہ الحاق کا مرحلہ آسانی سے طے ہو گیا۔ ہمارے کانگریس کمیٹی سب سے پہلی کمیٹی ہے جو برٹش ایمپائر سے باہر قائم ہوئی۔

تیسرا نوجوان جن کا ہم تعارف کرانا ضروری سمجھتے وہ شیخ محمد اقبال شیدائی ہیں۔ میرا مولد سیالکوٹ ہے اور شیدائی بھی سیالکوٹی ہیں۔ ہم وطن کی محبت میں ہم ایک دوسرے سے زیادہ قریب ہوئے۔ شیدائی صاحب ہمارا کوئی پرانا رشتہ دار نہیں تھا۔ اس لیے خیالات میں ہم زیادہ متفق نہ ہوئے ہوں مگر عملاً ہم ایک بن گئے تھے۔ اور آگے چل کر تو خیالی افتراق بھی کم ہو گیا۔ میں لکھ چکا ہوں کہ شیخ محمد ابراہیم مرحوم کے ساتھ اپنا بھتیجہ عزیز احمد کابل میں پہنچ چکا تھا۔ میرے ساتھ جو تین آدمی آئے تھے۔ ان میں سے ایک میرا بھتیجہ محمد علی بن حبیب اللہ تھا۔ راجہ صاحب کے گھر پر میں نے محمد علی کو بھیجا تھا۔ اور قندھار کے محاذ پر سردار اعتماد الدولہ کی خدمت میں اسی کو معین کیا تھا۔ سردار اعتماد الدولہ نے اس کی خدمات کے اعتراف میں اسے خاص خلعت سے سرفراز کیا تھا۔ میرے یہ دونوں عزیز میری خاص خدمات کے متکفل رہے کھانا کپڑا دوا کے متعلق مجھے کسی دوسرے کی امداد کی ضرورت نہیں ہوئی ہمارے کابل کی زندگی کے آخری ایام

میں مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مولانا حسین احمد جیل میں تھے۔ اور ہمارے رفیق کو ہم سے علحدہ کرنے کی تجویز ہو رہی تھیں۔ اس حالت میں آرام سے بیٹھ کر شاہی مہمانی سے لطف اٹھانا ہمارے لیے ناممکن تھا۔ سویٹ رشیا کے تعلقات کی ابتدا اعلیٰ حضرت امیر امان اللہ خاں کی اجازت اور مصلحت سے بروئے کار آئی۔ جس میں راجہ مہندر پرتاپ نے کافی حصہ لیا۔ انھیں کی تجویز پر ہمارے نوجوان رفیق آتے جاتے رہے۔ جب ماسکو میں ہندستانی اشتراکی جماعت قائم ہوئی اور اس کا مرکز تاشقند قرار دیا گیا اس کے لیڈر نیدرا ناتھ رائی جو کئی سال تک اسے چلاتے رہے۔ اس عہد میں ہمارے دوست بن گئے کہ مرزا محمد علی اس جماعت میں شریک ہو چکے تھے۔ اس طرح ہمارے معاملات سنجیدگی سے درست ہوتے گئے۔ اب ہم نومبر ۱۹۲۲ء میں دریا جیحون عبور کر کے ترمذ میں سویٹ کارندوں کے مہمان ہوئے اور دنیا کی انٹرنیشنل سیاست کا نیا مشاہدہ شروع کر دیا۔ ہم نے اپنے حالات کسی قدر اختصار کے ساتھ اپنی سیاسی پروگرام کے شروع میں لکھے ہیں۔ اور مکہ معظمہ میں رہتے ہوئے بعض واقعات زندگی عرب دوستوں کی واقفیت کے لیے عربی میں لکھی ہیں۔ مگر یہ بات ہمیں ہمیشہ محسوس ہوتی رہی کہ اگر کسی قدر حالات کابل کے قیام اور وہاں

سے رخصت ہونے کے متعلق مستقل نہیں تحریر کریں گے ۔ تو اس اقتدار
کو سمجھنا بہت مشکل ہوگا ۔ الحمد للہ آج اس سے بھی فارغ ہوئے ۔
صلی اللہ علی سیدنا محمد و آلہ وسلم و آخر دعونا ان الحمد للہ رب العالمین ۔

۲۰ر جمادی الآخر ۱۳۵۲ھ
بلد الحرام حارۃ الباب

عبید اللہ السندھی
سابق ناظم جمعیۃ الانصار دیوبند "
" سابق ناظم نظارۃ المعارف دہلی

تمت